شمیم طارق
غالب
اور
ہماری تحریکِ آزادی
دوسرا ایڈیشن

شمیم طارق

انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی

دوسرا ایڈیشن (ترمیم واضافہ کے ساتھ)

© شمیم طارق

نام کتاب : غالب اور ہماری تحریکِ آزادی

مصنف : شمیم طارق

بارِاوّل : فروری ۲۰۰۲ء [محمد حاجی صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی، ممبئی کے سابق طلباء کی تنظیم-اوساOSA، ممبئی-۸ نے شائع کیا تھا۔]

باردوم : اگست ۲۰۰۷ء

تعداد : پانچ سو (۵۰۰)

صفحات : ۲۲۴

کمپوزنگ : جاوید یوسف

طباعت : غزالی ٹائپ سیٹرس اینڈ پرنٹرس، فون:40021044

قیمت : ۲۰۰؍ روپیے

ناشر : شمیم طارق، فلیٹ نمبر ۲۷، چوتھا منزلہ، مرزبان مینشن، بائیکلہ فروٹ مارکیٹ، بائیکلہ، ممبئی-۴۰۰۰۲۷

ملنے کا پتہ : ۱) سیفی بک ایجنسی، ۱۰/۱۱، امین بلڈنگ، ۵۳/ ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی-۴۰۰۰۰۳، فون: ۲۳۷۴۲۶۹۰

۲) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ممبئی، علی گڑھ

۳) نئی کتاب پبلشرز

ڈی-۲۴، ابوالفضل انکلیو، پارٹ-I، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

GHALIB AUR HAMARI TAHREEK -E- AZADI

By: **Shamim Tariq** First Edition : February 2002,

Published by : OSA- Old Students Association of M. H. Saboo Siddik Institute of Engineering & Tech. Mumbai-8

2nd Edition : August 2007 Price : 200/-

Published by : **Shamim Tariq,** Flat No. 27, 4th Floor, Marzaban Mansion, Byculla Fruit Market, Byculla , Mumbai - 400 027

Printed at : Maulee Print & Art, Mumbai

Available at :

1) **Saifee Book Agency** : 10/11, Amin Building, 53, E. R. Road, Mumbai - 400 003. Tel. : 2374 2690
2) **Maktaba Jamia Ltd** Delhi, Mumbai & Aligarh
3) **Nai Kitab Publishers,** D-24, Abul Fazl Enclave, Part-I, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

(ماؤلی پرنٹس اینڈ آرٹس، ممبئی میں طبع ہوئی)

۱۸۵۷ء کے

حریت پسندوں کے

نام

جن کے خون کے قطروں سے

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو

یہ ارضِ وطن

لالہ زار

ہوئی

ترتیب

تبصرے اور آراء

[تمام تبصروں کی شمولیت ممکن نہیں تھی۔ اس لئے غالبیات اور تحقیق کی نامور شخصیات کے تبصروں کے مختصر اقتباسات پر اکتفا کیا گیا ہے۔]

پروفیسر گوپی چند نارنگ

شمیم طارق ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں اور ان کی تصنیف ''غالب اور ہماری تحریک آزادی''
اہم اور بحث انگیز تصنیف ہے جو غالبیات میں بحث کے نئے دروازے کھولتی ہے۔ادب کی دنیا
مذہب کی دنیا نہیں ہوتی ادب میں جتنے اختلافات ہوتے ہیں اتنے ہی نئے مباحث سامنے آتے
ہیں۔اس کتاب میں جو مواد جمع کیا گیا ہے وہ بہت عالمانہ ہے اور عرق ریزی سے جمع کیا گیا ہے۔
البتہ جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان میں ہر شخص کا اپنا نقطۂ نظر ہو سکتا ہے، تحقیق میں اختلاف ہونا اچھی
بات ہے۔ مجموعی طور پر شمیم طارق کی کتاب حوصلہ مندی اور عرق ریزی کی مثال ہے جس میں اس
موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لئے بہت زیادہ مواد ہے۔ غالبیات اور اقبالیات اتنے وسیع
میدان ہیں کہ جس میں مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام، غلام رسول مہر اور کالی داس گپتا رضا نے اپنی
پوری عمر صرف کردی تھی۔شمیم طارق نے اس میدان میں قدم رکھتے ہی ادبی بحث کا ایک ایسا دروازہ
کھولا ہے، جس پر زمانہ برسوں داد دیتا رہے گا۔

[''غالب اور ہماری تحریکِ آزادی'' کے اجراء پر کی گئی تقریر سے]

پروفیسر نثار احمد فاروقی

آج کی ڈاک سے آپ کی کتاب ''غالب اور ہماری تحریکِ آزادی'' کا ایک نسخہ ملا۔نہایت
ممنون و مسرور کیا۔کتاب کو ایک نظر دیکھ کر اور فہرست مطالعہ پر سرسری نظر ڈال کر ہی اندازہ ہو گیا کہ
اس موضوع پر یہ ایک اہم کام ہوا ہے۔اسے فرصت پا کر پڑھتا رہوں گا اور استفادہ کروں گا۔

آپ نے یہ اچھا کیا کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے خطوط سے اقتباسات یکجا کر دیئے۔
ان کی مدد سے واقعات کا تسلسل سمجھا جا سکتا ہے۔یہ کام غالب جیسے عظیم شاعر اور نثر نگار کے شان
شایاں ہے، خالص تحقیق اور محنت کا ثمرہ ہے، ایک مصدر و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور آئندہ بھی
غالب پر کام کرنے والوں کی راہیں روشن کرتا رہے گا۔جنہوں نے غالب کی شخصیت اور اس کے عہد کا
مطالعہ نہیں کیا ہے وہ آپ پر پتھراؤ کریں گے مگر مدلل جواب نہیں دے سکیں گے۔ میں آپ کے
مطالعے سے بھی متاثر ہوا اور طرزِ استدلال سے بھی۔

کتابیات کا حصہ دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ شاید میری کتاب ''تلاشِ غالب'' آپ کی نظر سے

نہیں گزری۔ اس میں ایک مضمون غالب اور سرسید کے تعلق سے بھی شامل ہے جس میں سرسید کے نام غالب کا ایک خط پہلی بار پیش کیا گیا تھا اور اس کا پس منظر بھی بیان کیا تھا۔

ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس علمی سوغات سے ممنون کیا۔

[۲/اپریل ۲۰۰۲ء کا خط]

ڈاکٹر خلیق انجم

شمیم طارق ایک ذہین، باشعور اور باصلاحیت نوجوان ہیں۔ ادب میں ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ نقاد ہیں، محقق ہیں، شاعر ہیں اور صحافی ہیں۔ جن لوگوں نے ان کی مختلف تصنیفات مثلاً ''سلطانِ جمہور ٹیپو شہیدؒ''، ''روشن لکیریں'' اور ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور تصوف'' جیسی کتابیں پڑھی ہیں وہ میری رائے سے ضرور اتفاق کریں گے کہ شمیم طارق کی ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی پر بہت اچھی نظر ہے، انہوں نے ان موضوعات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ان کو اردو زبان پر بہت اچھی قدرت حاصل ہے۔ ان کا اسلوبِ نگارش منفرد ہے۔ عام فہم اور معیاری زبان پر ان کو جو قدرت حاصل ہے اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ وہ روزنامہ 'اردو ٹائمز'، ہفت روزہ 'ہمعصر' کے مدیر اور ہفت روزہ اردو 'بلٹز' کے نائب مدیر رہے ہیں۔ ہندوستان کے ممتاز رسالوں اور اخباروں میں بڑی تعداد میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کتابوں اور مضامین کی وجہ سے شمیم طارق کو وہ عزت اور شہرت نصیب ہوئی ہے، جو اس عمر کے لوگوں کو کم حاصل ہوتی ہے۔ غالب پر ہزاروں کی تعداد میں مضامین اور سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی بار کسی محقق نے اتنے حساس، لیکن اہم مسئلے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس موضوع پر کتاب لکھنے کے لئے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کئی لوگوں نے یہ بھاری پتھر اٹھانے کی کوشش کی، لیکن اسے چوم کر چھوڑ دیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ موضوع کو چھو کر نکل گئے، کوئی اہم اور بنیادی بات نہیں کہی، شمیم طارق پہلے اسکالر ہیں جنہوں نے اس موضوع پر پوری کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شمیم طارق کی ہندوستان کی تاریخ پر کتنی گہری نظر ہے۔ انہوں نے کتاب کے پہلے باب میں عہد غالب کے سماجی، اقتصادی اور مذہبی حالات کا بہت عالمانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ اس عہد کی سیاسی تحریکوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ شمیم طارق بزرگوں کا احترام تو کرتے ہیں، لیکن ان سے اگر اختلاف ہے تو اس کا بڑے ادب سے اظہار کر دیتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے فضل حق خیر آبادی کے سلسلے میں مولانا امتیاز

علی خاں عرشی اور مالک رام صاحب کے خیالات سے اختلاف کیا ہے لیکن احترام کے ساتھ۔
یہ کتاب پڑھ کر مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ انہوں نے جہاں کہیں کسی محقق سے اختلاف کیا ہے وہاں ادب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔
[تبصرے سے اقتباس، ہماری زبان، دہلی، یکم تا ۷ جون ۲۰۰۲ء]

ڈاکٹر سید عبدالباری

بہت دنوں کے بعد غالب پر ایک اچھی کتاب منظر عام پر آئی ہے جس میں نہ تو عبدالرحمٰن بجنوری کی غالب پرستی اور نہ مرزا یگانہ چنگیزی کی غالب شکنی کا انداز ہے بلکہ ایک ٹھنڈے دماغ سے انیسویں صدی کے اس ممتاز شاعر کی عظمت کا اعتراف بھی ہے اور بحیثیت انسان اس کے اندر جو خامیاں تھیں اور جو کبھی اس کے فن پاروں سے منعکس ہوتی تھیں ان کا تجزیہ بھی ہے۔ شمیم طارق نے یہ کتاب بڑی محنت اور تلاش وجستجو وسلیقہ مندی سے مرتب کی ہے۔ انہوں نے بعض ایسے نوادر اس کتاب میں شامل کر دیئے ہیں جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ مثلاً الثورۃ الہندیہ (مولانا فضل حق خیر آبادی) کا اردو ترجمہ اور مولانا کا قصیدہ ہمزیہ ودالیہ جس میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی دردناک تصویریں ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے خطوط کو تاریخی ترتیب سے پیش کر کے طارق صاحب نے غالب پر کام کرنے والوں کی راہ آسان کر دی ہے۔ ''غالب اور ہماری تحریکِ آزادی'' اور ''غالب اور سرسید'' اس مجموعے کے تنقیدی نقطۂ نظر سے خاصے وقیع مضامین ہیں۔ اس کتاب کے مصنف نے غالب کے عہد اور Situation کے پس منظر میں ایک حساس، مجبور و بے بس اور بڑی حد تک اپنے ذاتی احوال اور زمانے کے طمانچوں سے نڈھال شاعر کا ہمدردانہ مطالعہ کیا ہے یا نہیں اس میں کلام ممکن ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہمیں اس نرالی جرأت مندانہ اور عام ڈھرے سے ہٹی ہوئی تنقید کی داد ضرور دینی چاہئے۔ میں نے ۲۵ سال یونیورسٹی کے آخری درجات کے اردو کے طلبہ و طالبات کو غالبؔ کے خصوصی مطالعہ میں جو راہنمائی حوالہ جاتی کتب کے سلسلہ میں کی کاش یہ کتاب پہلے آگئی ہوتی تو میرے لئے تنکے تنکے جمع کر کے آشیانہ تعمیر کرنے کے بجائے ایک خزانۂ بے بہا یکجا حاصل ہونے کے مترادف ہوتی۔ میں اس کتاب کے مطالعہ کا ہر اس شخص کو مشورہ دوں گا جو غالب کی ہمہ جہت شخصیت کا گہرائی سے جائزہ لینے کا آرزومند ہے۔

[تبصرے سے اقتباس، ''پیش رفت''، جولائی ۲۰۰۲ء]

ڈاکٹر شمس بدایونی

مرزا غالب پر ہندو پاک میں ہر سال چار چھ کتابیں منظر عام پر آتی ہیں، لیکن اکثر کتب سال چھ مہینے تبصروں کے بل پر زندہ رہ کر غالبیات کے انبار میں دفن ہو جاتی ہیں۔ بہت کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک طویل عرصے تک مطالعہ غالب کو مہمیز کرتی ہیں اور حوالے کے کام بھی آتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کتاب شمیم طارق کی مصنفہ "غالب اور ہماری تحریکِ آزادی" ہے۔

غالب جس طرح حیات و کائنات کے مسائل کو سوالات کی زد میں لے آتے ہیں، شمیم طارق نے بھی ۱۸۵۷ء کی حریت سے متعلق غالب کے رویّے پر بعض سوالات قائم کردیئے ہیں۔ یہ سوالات ایسے ہیں جن کی زد میں غالب کی ادبی شخصیت اور سماجی کردار آجاتا ہے اور وہ قومیت و وطنیت کے علم بردار شعراء، ادباء اور علماء کی صف سے باہر کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات ان کا کردار ایک عام انسان کے کردار سے بھی پست نظر آتا ہے۔ شمیم طارق نے ان سوالات کے جوابات میں جو کچھ لکھا ہے وہ اتنا مدلل اور جامع ہے کہ اس کی تردید بھی بہ ظاہر ممکن نہیں۔

ادبی تحقیق میں زود یقینی، خوش گمانی اور جذباتیت کی مطلق گنجائش نہیں۔ واقعات جس طرح رونما ہوتے ہیں، جو اسباب و وجوہات ان کے وقوع پذیر ہونے کا سبب بنتے ہیں، ان سے تحقیق میں صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

شمیم طارق نے غالب کی عظمت کے تمام تر اعتراف واظہار کے باوجود اس سچائی کو من وعن تاریخی دستاویزوں اور تحقیقی حوالوں کے ساتھ پیش کردیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی حریت میں غالب کا شخصی کردار ٹھیک نہیں رہا۔ وہ ہندوستان کے قومی دھارے سے کٹے رہے اور اپنے آپ کو محفوظ اور مضبوط کرنے میں لگے رہے۔ شمیم طارق کی تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ غالب کو ہندوستان کے تباہ و برباد ہونے اور غیر ملکیوں کے تسلط میں چلے جانے کا مطلق غم نہیں تھا انہیں غم تھا تو صرف یہ کہ اب ان کے شب و روز کیسے بسر ہوں گے۔ ان کے احباب، مربی و قدردان جو ان پر نوازشیں اور عطیات و انعامات کی بارش کیا کرتے تھے، وہ رخصت ہو گئے اب گذشتہ مراعات کیونکر بحال ہوں گی؟ ان مراعات کے حصول کی خاطر ہی وہ ۵۷ء کے بعد خود کو دولتِ انگلشیہ کا بہی خواہ اور وفادار ثابت کرتے رہے اور اس کے لئے طرح طرح کے حیلے اختیار کرتے رہے۔ ان حیلوں کی تفصیلات شمیم طارق نے غالب کی اپنی تحریروں اور معاصر ماخذ کے حوالوں سے دی ہیں۔

شمیم طارق نے تضادات سے بھرپور غالب کی شخصیت کے ایک اہم پہلو اور حساس حصے کو

مطالعے کا موضوع بنایا ہے اور اس کے جملہ متعلقات اور جزئیات پر پہلی مرتبہ واضح، مربوط اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے عظیم سانحے سے معاصرین غالب کی وابستگی اور ان کے ذہنی رویے کو بھی پیش کیا ہے۔ آزادی کے لئے ہندوستان میں برپا سیاسی، مذہبی اور علمی تحریکوں کا جائزہ بھی لیا ہے تا کہ غالب جیسے نابغہ شاعر کی اس سانحۂ عظیم سے عملی وفکری ناوابستگی اور خود غرضانہ ذہنی کیفیت کو علمی طور پر مطالعہ کا عنوان بنایا جا سکے۔

۱۸۵۷ء کے خوں آشام سانحے سے غالب کی لاتعلقی ان کے روئے عظمت پر ایسا بدنما داغ ہے جسے عام طور پر یا تو نظر انداز کیا جاتا رہا یا اس کی تاویل کی جاتی رہی۔ مجھے یقین ہے کہ شمیم طارق کی پیش کردہ تحقیقات کو مستقبل کے غالب شناس پیش نظر رکھیں گے اور غالب کی شخصیت کے معروضی مطالعے کی راہ ہموار کریں گے۔

[غیر مطبوعہ تبصرے سے اقتباس]

☆☆☆

دوسرے ایڈیشن پر دو لفظ

'غالب اور ہماری تحریکِ آزادی' کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی کے ایماء پر ایم. ایچ. صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے سابق طلباء کی تنظیم-اوسا (OSA) نے شائع کیا تھا۔ کتاب منظر عام پر آتے ہی کمیاب ہو گئی۔ کچھ نسخے 'اوسا' کے دفتر میں رکھے ہوئے تھے جو کوشش کے باوجود دستیاب نہیں ہوئے۔ اہلِ علم کے اصرار پر میں نے دوسرا ایڈیشن خود شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''اوسا'' کے صدر پرنسپل محمد ہارون صاحب نے دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ انجمن اسلام کے صدر محترم سمیع خطیب صاحب اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی صاحب نے بھی اعتراض نہیں کیا البتہ خواہش ظاہر کی کہ کتاب پر اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی کا نام باقی رکھا جائے۔ میں دونوں حضرات کی اس خواہش کو کتاب کی قدردانی پر محمول کرتا ہوں۔

اشاعتِ نو کے مقصد سے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہیں کہیں لفظوں، جملوں اور حوالوں کے اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ طویل اقتباسات شامل کیے جانے کی بھی گنجائش تھی مگر اس صورت میں صفحات بہت بڑھ جاتے۔ لہٰذا میں نے اسی حد تک اضافہ کیا کہ زیادہ صفحات نہ بڑھانے پڑیں اور ایک عام قاری عبارت کا مفہوم و پس منظر بھی سمجھ جائے۔ اس کے باوجود ۳۰ صفحات بڑھ گئے۔ ان ۳۰ صفحات میں دو نئے ابواب بھی شامل ہیں۔ ''توقیتِ غالب [۱۸۵۷ء سے وفات تک]'' اور ''۱۸۵۷ء کے بعد غالب کی مطبوعات''۔ امید ہے کہ ان ابواب کی شمولیت سے ۱۸۵۷ء کے بعد کے غالب کی علمی سرگرمیوں کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

لفظوں، جملوں، حوالوں، سنین، مختصر اقتباسات اور دو ابواب کے اضافوں کے ساتھ ایک اور کام میں نے یہ کیا کہ ڈاکٹر شمس بدایونی کو یہ کتاب اس درخواست کے ساتھ بھیج دی کہ وہ اس سے دشمنوں جیسا سلوک کریں۔ ڈاکٹر شمس سے میری ایک ہی ملاقات ہے مگر چونکہ تحقیق و تنقید میں راست گفتاری و دیانت داری کے علاوہ متانت و سنجیدگی ان کا شیوہ ہے اس لئے ان سے قرب اور انس محسوس ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے کتاب کو حرف حرف پڑھا۔ مزید کچھ حوالوں پر اصرار کیا، کہیں کہیں ایک دو سطر حذف کرنے کا مشورہ دیا اور کتاب واپس کر دی۔ میں ان کا نہ صرف شکر گزار ہوں بلکہ احسان مند ہوں۔

پہلے ایڈیشن پر غالب، عہدِ غالب اور غالبیات پر نظر رکھنے والوں نے بہت حوصلہ افزا تبصرے کئے تھے۔ ایک خط اور دو تبصرے رد میں بھی شائع ہوئے مگر وہ ایسے لوگوں کے تھے جن کا غالب، عہدِ غالب اور غالبیات سے تعارف ابھی باقی ہے۔ دوسرے ایڈیشن کا مطالعہ کرنے والے محسوس کریں گے کہ اضافوں اور حوالوں کے سبب یہ کتاب پہلے سے زیادہ مدلل ہوگئی ہے۔

غالب میرے بھی ممدوح ہیں۔ ان کے مرتبے کو کم کرنا مقصود نہیں، یہ کتاب صرف یہ دیکھنے کی کوشش ہے کہ وہ غالب جو

☆ شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر متعین تھے

☆ آزادی واحتجاج کی آواز بلند کرنے والے شاعر سمجھے جاتے ہیں اور

☆ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے عینی شاہد اور روزنامچہ لکھنے کے مدعی تھے

انہوں نے ۱۸۵۷ء کے دوران اور اس کے بعد حملہ آوروں کے بارے میں کیا نقطۂ نظر اختیار کیا؟

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کی ڈیڑھ سو سالہ یاد کے موقع پر اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت مناسب و برمحل ہے اور یاددہانی کراتی ہے کہ غالب اپنی تمام تر شاعرانہ عظمتوں کے باوجود یہی نہیں کہ ان مجاہدینِ آزادی میں شامل نہیں ہیں جن کے خون کے قطروں سے سرزمینِ ہند لالہ زار ہوئی بلکہ وہ ان شہیدانِ وطن کے بارے میں اچھی رائے بھی نہیں رکھتے تھے۔

شمیم طارق

۴/اگست، ممبئی ۲۰۰۷ء

پیش لفظ

'شرف محنت و کفالت' کے تیسرے اڈیشن پر میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ'' جناب شمیم طارق کا نام اردو تنقید و تحقیق اور شعر و صحافت کا وہ نام ہے جو دنیاداری سے بے نیاز ہو کر بھی دنیا والوں میں بہت مقبول ہے اور مجھے امید ہے کہ وقت کے ساتھ یہ مقبولیت بڑھے گی۔ ان کی نظم و نثر میں صالح فکر اور تازہ تر اسلوب نگارش کے تمام سوتے اس صاف شفاف چشمۂ حیات سے پھوٹتے ہیں جس کا نام تصوف یا باطنی روحانی ترنگ ہے۔ اس ترنگ نے انہیں سرخرو بھی کیا ہے اور آزمائشوں سے بھی دوچار کیا ہے مگر وہ ہر آزمائش میں کھرے اترے ہیں۔ کم و بیش ۲۰ برس یعنی شمیم طارق کے لڑکپن اور نوجوانی کے سال دیکھتے دیکھتے میرے سامنے گزرے ہیں مگر اس بگڑنے کی عمر میں بھی وہ بنے رہے ہیں اور بافیض و بامقصد زندگی گزارنے کی تڑپ اور ترنگ نے انہیں '' ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی'' کی راہ دکھائی ہے۔ ایمانداری اور علمی جزرسی سے ان کا صحتمند رشتہ ہمیشہ استوار رہا ہے۔''

دوبارہ ان کی تازہ ترین تحقیقی کتاب '' غالب اور ہماری تحریک آزادی'' پر مجھ سے لکھنے کے لئے شاید اس لئے کہا گیا ہے کہ میں عمر بھر غالب کو اور غالب کے بارے میں پڑھتا رہا ہوں اور غالب پر میرا تھوڑا بہت کام بھی ہے لیکن اس کتاب کے بارے میں میری ذہنی قلبی کیفیت یہ ہے کہ اگر اس کے لائق مصنف عزیزی شمیم طارق اس پر کچھ لکھنے کی دعوت نہ دیتے تو بھی میں اس پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا اور کسی رسالہ کو ارسال کرتا۔

اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ کتاب کے کئی باب مضمون کی شکل میں اہم ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور میں نے نہ صرف انہیں پڑھا ہے بلکہ ان پر گفتگو کرتا رہا ہوں۔ غیر مطبوعہ ابواب پر بھی ان سے گفتگو ہوتی رہی ہے۔ دوسرے اس لئے کہ موضوع بہت اہم ہے۔ غالب کا اس حیثیت سے مطالعہ بہت ضروری ہے کہ ملک کی آزادی کے لئے جو جنگ ان کی زندگی میں شروع ہوئی تھی، اس کے بارے میں ان کی سوچ اور رویہ کیا تھا؟

اس موضوع پر جب ان کا پہلا مضمون ماہنامہ آج کل، نئی دہلی (فروری ۱۹۹۹ء) میں شائع ہوا تو میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آخر اس حساس اور انتہائی تحقیق طلب موضوع پر لکھنے کی انہیں کیسے سوجھی؟ اور ان کا برجستہ جواب تھا کہ کیا یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ عظیم غالب جن کے آزادی، انکار اور تشکیک کا شاعر ہونے کی دہائی دی جاتی ہے، تمام تر شاعرانہ عظمت اور دانشورانہ فراست کے باوجود یہ

اندازہ کیوں نہیں کر سکے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے صرف ۹۰ برس بعد اوران کے انتقال کے صرف ۷۸ برس بعد انگریزوں کو یہ ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا؟ انہوں نے ارنسٹ جونز کا حوالہ دے کر جو ۱۸۵۷ء کے واقعات، ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم اوران کا ملک ہڑپنے کی کوششوں کے خلاف برطانیہ ہی میں رہتے ہوئے تحریر وتقریر اور نظم ونثر کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف تحریک چلا رہا تھا، ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں غالب کے کردار کے دفاع کواور بھی مشکل بنادیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب اسی موضوع پر ہے اور خوبی یہ ہے کہ موضوع کے ہر پہلو پر نظر رکھتے ہوئے اس باب میں جو بات کہی گئی ہے، حوالے اور دلیل کے ساتھ کہی گئی ہے۔

اس موضوع پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کی کتاب ''غالب اور انقلاب ستاون'' پہلے سے موجود ہے مگر اس میں دستنبو، خطوط اور اقتباسات کی بھر مار ہے، مصنف کا تجزیہ اور اخذ کیا ہوا نتیجہ بہت کم ہے۔ لیکن جناب شمیم طارق نے کتاب کے اس باب میں وہ سب کہہ دیا ہے جو ایک ذہین وسنجیدہ قاری اس سلسلہ میں جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے۔

اخذ کیے ہوئے نتائج اور طرز استدلال کے علاوہ ایک اور بہت اہم خوبی جو اس باب کی ہے وہ اس کے ماخذ ہیں۔ مختلف فکر وخیال کے مصنفین کے بیانوں، حاکموں کی یادداشتوں اور رپورٹوں کی بنیاد پر پہلے تو انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو جنگ شروع ہوئی، بظاہر تو وہ ایک ہنگامہ کی طرح تھی اور ناکام ہوئی مگر اپنی روح کے اعتبار سے وہ جنگ آزادی تھی اور اسی جنگ آزادی کا نتیجہ تھا کہ ۹۰ برس بعد ہمارا وطن آزاد ہوا اور وطن کی آزادی کے لئے جان دینے والوں کے اعزاز کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کی نشاندہی کی جائے جو شہیدوں کے خون کو 'خون رائیگاں' سمجھتے تھے۔ جناب شمیم طارق نے یہی کام کیا ہے اور بڑے سلیقے اور دیانت سے کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں غالب کے کردار کا دفاع ان شہیدانِ وطن کی توہین ہوگی جنہوں نے اس لئے انگریزوں کے خلاف مسلح مزاحمت اور جنگ کی تھی کہ وہ اس ملک سے بھاگ جائیں۔ اس باب میں بیان کیا ہوا یہ نکتہ بھی بہت اہم ہے کہ کلکتہ کے جس روشن خیال طبقے نے انگریزوں سے سب سے پہلے ناطہ جوڑا تھا، ۱۸۵۷ء کے بعد وہ بھی ان کا مخالف ہوگیا تھا مگر غالب کی انگریزوں سے وفاداری آخری سانس تک قائم رہی۔

اس سے پہلے کے باب میں، جو کتاب کا بھی پہلا باب ہے'' غالب اور عہدِ غالب'' میں اس عہد کے سماجی، سیاسی، اقتصادی حالات اور استحصال کے ساتھ اہم مذہبی سماجی سیاسی تحریکوں کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ضمیمے کے طور پر علامہ فضل حق خیرآبادی کے ایک رسالہ اور دو

قصائد کی بھی دوبارہ اشاعت کی گئی ہے۔ رسالہ اور قصیدے نایاب ہیں اور لسانی اور فنی محاسن کے ساتھ ان میں آزادی کی جو تڑپ ہے، اسی کا ایک دوسرے قصیدے سے اندازہ کرتے ہوئے میں نے جناب مالک رام اور مولانا عرشی کے موقف سے اختلاف کیا تھا اور اس سلسلہ میں واضح کیا تھا کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ علامہ جنگ آزادی میں شریک نہیں تھے۔ لیکن جناب شمیم طارق نے الثورۃ الہندیہ اور دو عربی قصائد سے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ انگریزوں سے تکلیف اٹھانے کے بعد علامہ ان سے بدظن تو ہو گئے تھے مگر ان کے جنگ آزادی میں شریک ہونے کے شواہد نہیں ملتے۔ جنگ آزادی کی تڑپ ہونا جنگ آزادی میں شرکت کی دلیل نہیں ہے۔

اس باب میں جناب شمیم طارق کو ایک اور مسئلہ میں بھی مجھ سے اختلاف ہے، وہ یہ کہ ان کی تحقیق میں علامہ فضل حق اور مولانا اسمٰعیل شہید کے درمیان اختلاف کی نوعیت تقلید اور عدم تقلید کے علمبرداروں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف کی نہیں تھی کیونکہ مولانا اسمٰعیل خود بھی مقلد تھے۔ ان کے اختلافات علمی نوعیت کے تھے۔ تحقیق میں صحتمند اختلاف سے آنے والی نسلوں کے ذہنوں کو روشنی ملتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جناب شمیم طارق کو تحقیق کے آداب کے ساتھ اختلاف رائے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو دلائل دیئے ہیں وہ میری تشفی کے لئے کافی ہیں۔

تیسرا باب تحریک آزادی کے پس منظر میں غالب اور سرسید کی کارگزاریوں کا موازنہ ہے اور حق یہ ہے کہ 'سمندر بہ کوزہ' کے مصداق اس ایک باب میں وہ ساری باتیں بلیغ جملوں میں لکھ دی گئی ہیں جن کے لئے کئی دفتر درکار ہیں۔ ان کے اس تجزیے سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ غالب کے انگریزوں سے تعلقات ذاتی اغراض پر مبنی تھے جبکہ سرسید احمد خاں کو ایک پورے طبقے کا مفاد عزیز تھا۔

چوتھا باب ''غالب کی قصیدہ گوئی'' ہر اعتبار سے معیاری مقالہ ہے اور اس میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں ان پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ قاضی عبدالودود، مالک رام، ڈاکٹر خلیق انجم اور خود میری تحقیق کی روشنی میں جو انکشافات کئے گئے وہ فوری طور پر تو طبیعت پر گراں گزرتے ہیں کیونکہ غالب اس طرح ہماری عقیدت پر چھائے ہوئے ہیں کہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں ہوتا مگر چونکہ تمام انکشافات دلائل و شواہد کی بنیاد پر ہیں، اس لئے مسترد بھی نہیں کئے جاتے۔

پانچواں باب ''دستنبو'' کا تجزیہ ہے۔ اس میں جو بات بھی کہی گئی ہے غالب کے اقبالی بیانات کے حوالے سے کہی گئی ہے۔ اس لئے انکار و اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

چھٹا باب ''ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے'' ۱۸۵۷ء کے بعد کہے گئے غالب کے اردو اشعار کی تعداد اور معیار پر بحث کے لئے وقف ہے۔ اس بحث میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے

کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات غالب کے شعری تجربے میں نہیں ڈھل سکے ہیں۔اس بحث میں غالب کی شعر گوئی کی قوت وصلاحیت پر زوال کی کیفیت کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

آخری باب غالب کے اردو خطوط کے ان حصوں پر مشتمل ہے جو کسی پہلو سے بھی ۱۸۵۷ء سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخی ترتیب اور مقالہ نگار کی عالمانہ تمہید سے اس باب کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔شاید ہی غالب کا کوئی اردو خط چھوٹا ہو، ۱۸۵۷ء سے متعلق انہوں نے جو کچھ بھی اپنے اردو خطوط میں لکھا، وہ سب بڑے سلیقے سے یہاں چن دیا گیا ہے۔

ہر باب دوسرے سے ہم رشتہ ہے اور پوری کتاب موضوع کا حق ادا کرتی ہے۔ ماخذ اور نتائج کے ساتھ ان کا طرز تحریر بھی بہت خوبصورت اور پر اثر ہے۔اتنی صائب رائے اور اتنی پر اثر نثر لکھنے والا ان کی نسل میں کوئی دوسرا کہاں ہے؟ تنقید، تحقیق، تخلیق نے گھل مل کر ان کی شخصیت اور تحریر میں جوندرت اور جاذبیت پیدا کی ہے، اس کا عکس اس کتاب میں بھی موجود ہے۔

اگر کتاب میں کہیں کوئی بات محتاج حوالہ رہ گئی ہو یا حوالے میں فرق آ گیا ہو تو یہ غفلت کی وجہ سے نہیں کام کی کثرت کی وجہ سے ہوا ہوگا کیونکہ جناب شمیم طارق غم روزگار میں غالب سے کم نہیں ہیں۔اس کے باوجود بے روزگاری میں بیوی بچوں کے ساتھ کئی دوسروں کا بھی خرچ چلاتے ہوئے یہ وقیع علمی تحقیقی کام کر کے انہوں نے نادر مثال قائم کی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا نے ان کے اندر کے محقق کو پہچانا اور ان کی تحقیقی کتاب کو منظر عام پر لانے کا انتظام کیا۔ ورنہ، شاید اس کتاب کی اشاعت نہ ہو پاتی کیونکہ اس علم دشمن شہر میں کون ایسا ہے جو اتنے اخراجات برداشت کرتا، جناب ڈاکٹر جمخانہ والا اور جناب شمیم طارق دونوں کے لئے غالب کے لفظوں میں میری دعا ہے کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

کالی داس گپتا رضاؔ
ممبئی، ۲۲ر فروری ۲۰۰۱ء

عرضِ مصنف

کسی شاعر و فنکار سے محبت کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں میں اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور گمنام گوشوں کو جاننے کی للک اور جستجو پیدا کی جائے۔ زیر نظر تحقیق یا کتاب بھی عظیم غالب سے محبت ہی کا نتیجہ ہے۔ اس کو غالب شکنی کے سلسلے کی کڑی نہ سمجھا جائے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کہے ہوئے اپنے شعروں میں سیدھے سادے لفظوں کو ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' بنا دینے کے ساتھ اس میں بے پناہ صوتی آہنگ بھر دینے والے عظیم غالب، دنیائے شعر و ادب میں ہر طرح سے غالب ہیں اور کسی بھی طرح ان کی شاعرانہ عظمت یا تخلیقی قوت کم کرنے کی کوشش خود کو بے وقعت کرنے کے مترادف ہے۔ انہوں نے آنسوؤں کو طنزیہ تبسم اور پژمردگی و آزردگی کو شوخی و شگفتگی میں ڈھالنے کی جو کامیاب کوششیں کی ہیں وہ نہ صرف قوس و قزح کی سی رنگت و کیفیت کی حامل ہیں بلکہ متضاد فکری اور ادبی حلقوں کے لئے یکساں طور سے تلاش و تحقیق کی بھی محرک ہیں۔

غالب اپنی ذاتی زندگی میں نیکوکار تھے یا گنہگار؟ اس سے کسی کو سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ جس غالب کے دانش ورانہ ذہن، آزادیٔ رائے اور انکار و احتجاج کی اخلاقی قوت کی دہائی دی جاتی رہی ہے انہوں نے اس انقلاب کی چاپ کیوں محسوس نہیں کی یا سن کر ان سنی کیوں کی جو نہ صرف ہندوستانیوں کے ایک بڑے حلقہ نے سنی (جس میں غالب کے قریبی دوست بھی تھے) بلکہ انگلستان میں بیٹھ کر ارنسٹ جونز، کارل مارکس اور دوسرے آزادی پسندوں نے بھی سنی اور پسند کی۔ کلکتہ میں بھی انہوں نے نئے علوم کی اساس، سائنسی ایجادات و اختراعات کی باتیں کیں، نئے زمانے کے استقبال میں آنکھیں بھی فرش راہ کیں مگر بنگالی ادیبوں اور شاعروں کے تخلیقی کرب اور قوم پرستی کے جذبات کو نہ سمجھ سکے۔

شاید غالب کی زندگی اور شخصیت کا سارا حسن ان کی شاعری میں پہلے ہی منتقل ہو چکا تھا اور چونکہ یہ تحقیق، قومی نقطہ نظر سے غالب کا مطالعہ ہے، اس لئے اس میں ایک ایسے شخص کی تصویر کھنچ گئی ہے جس کو آسائش، رتبہ اور عزت کے سوا کچھ عزیز نہیں تھا۔ ملک کی آزادی بھی نہیں جو حقیقت میں فرد اور قوم دونوں کا پیدائشی حق اور قدرت کا عطا کیا ہوا بے بہا جذبہ تو ہے ہی، آسائش، رتبہ اور عزت کو

برقرار رکھنے کا ذریعہ بھی ہے کیونکہ ایک غلام شخص، یا غلام قوم کے فرد کے لئے آسائش ورتبہ کیا اور عزت کیا؟

اس کتاب کی ہر سطر محنت اور دیانتدارانہ غوروفکر کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی تحقیق کے دروازے کھلے ہوئے ہیں ۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میرے اخذ کئے ہوئے نتائج سے علمی شواہد کی بنیاد پر اختلاف کیا جائے۔

شمیم طارق
ممبئ، یکم مئی ۲۰۰۱ء

غالب اور عہدِ غالب

۱۷۹۸ء میں جب لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل بنا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی جڑیں بڑی گہرائی تک پیوست ہو چکی تھیں۔ دیسی حکمرانوں میں سوائے ٹیپو سلطان کے کوئی ایسا حکمراں نہیں تھا جو انگریزوں سے لڑنے اور انہیں شکست دینے کے بارے میں سوچنے کی بھی ہمت کر سکتا۔ اس لئے انگریزوں نے نظام اور مراٹھوں کو ساتھ لے کر ٹیپو سلطان کو نہ صرف شکست دینے بلکہ ان کی سلطنتِ خداداد کو پوری طرح نیست و نابود کر دینے کے منصوبے اور کوشش کو اپنے تمام منصوبوں اور کوششوں میں اولیت دی اور بالآخر ۴ر مئی ۱۷۹۹ء کو جیسے ہی ٹیپو سلطان شہادت سے سرخرو ہوئے یکے بعد دیگرے تمام ہندستانی ریاستوں کے کمپنی کے اقتدار کا حصہ بننے کا سلسلہ شروع ہوا اور اس طرح چند برسوں میں ہی سارا ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے زیرِ نگیں آ گیا۔

یہی غالب کی پیدائش کا زمانہ (۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء) ہے۔ ۱۸۰۶ء میں غدر ویلور کو چھوڑ کر جس کو انگریزوں نے چھوٹے پیمانے پر ۱۸۵۷ء کا ریہرسل کہا ہے[1]، غالب کے ۲۵-۲۶ برس کی عمر کو پہنچنے تک انگریز نہایت اطمینان و استقلال کے ساتھ اپنی قوت کو مجتمع اور دائرۂ اقتدار و اختیار کو وسیع سے وسیع تر کرتے رہے۔ لیکن اس توسیع پسندی اور ہندوستانیوں سے ان کا ملک و اقتدار چھیننے کے تنہا ذمہ دار انگریز یا بیرونی حملہ آور نہیں تھے۔ یہ موقع خود ہندوستانیوں نے انہیں مہیا کیا تھا۔ نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حملوں اور سازشوں نے یقیناً دولت تیموریہ کی جڑیں اور دلی کی مرکزیت متزلزل کر دی تھی مگر ان حملوں اور سازشوں کے بہت پہلے سے امراء، جاگیردار اور معاشرہ کی بعض اندرونی خرابیاں دولت تیموریہ کے ساتھ ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی سالمیت کو بھی فساد و انتشار سے دو چار کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔

اورنگ زیب کی اقبال مند شخصیت کی موجودگی میں تو ہندوستان کو غلامی کی راہ پر لیجانے والے فتنوں کو پنپنے کا موقع نہیں ملا لیکن اس کی آنکھ بند ہوتے ہی (۱۷۰۷ء) وہ تمام شر پسند ملکی اور غیر ملکی طاقتیں جو بہت عرصہ سے ہندوستان کی مرکزیت کو نقصان پہنچانے اور یہاں اپنا تسلط جمانے کی گھات میں تھیں، یکا یک آزاد ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں جس کے نتیجے میں وہ دولت تیموریہ جو برصغیر میں مسلم طاقت اور مسلم ثقافت کی آخری وارث اور امین ہونے کے ساتھ پوری طرح ہندوستانی بھی

1.Memoirs of General Briggs, London 1885, page 24

تھی اور جس نے ہندوستان کے ثقافتی ورثے کو ۲۰۰ سال سے بھی کم عرصے میں بام عروج پر پہنچادیا تھا،مکمل طور سے ختم ہونے سے پہلے ریزہ ریزہ ہوکر بکھرنے لگی تھی۔

شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کے دور سے اگر حالات کا جائزہ لیں، جنہوں نے اسی برس اپنے والد کے مدرسہ میں مسند تدریس سنبھالی تھی (۱۷۱۹ء) جس برس عالمگیر اورنگ زیب (ف ۱۷۰۷) کے تخت پر محمد شاہ متمکن ہوا تھا (۱۷۱۹ء) تو وہ پورا عہد اپنی تمام تر برائیوں اور پیچیدگیوں کے اثرات ومضمرات کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔شاہ ولی اللہ کونو سلاطین دہلی کو دیکھنے اور ان کے دور اقتدار کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔یہ سلاطین تھے۔(۱) بہادر شاہ اول [۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء] (۲) جہاندار شاہ [۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۲ء] (۳) فرخ سیر [۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء] (۴) رفیع الدرجات [۱۷۱۹ء تا ۱۷۱۹ء] (۵) رفیع الدولہ [۱۷۱۹ء تا ۱۷۱۹ء] (۶) محمد شاہ [۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء] (۷) احمد شاہ [۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء] (۸) عالمگیر ثانی [۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء] (۹) شاہ عالم ثانی [۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء]۔

آخر الذکر سلطان کے عہد میں، شاہ صاحب کے انتقال (۱۷۶۲ء) کے تقریباً دو برس بعد کلائیو نے بمقام الہ آباد بادشاہ سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی لے کر کمپنی کے حوالے کردی تھی۔ اس کے علاوہ ان سلاطین کے دور میں ہندوستانیوں کو لرزہ خیز مظالم بھی برداشت کرنے پڑے تھے۔ سادات بارہ کے تسلط، ان کے ہاتھوں فرخ سیر کے بصد بیکسی قید میں مرنے، تورانی امراء کے ہاتھوں سادات بارہ کے زوال، مراٹھوں کی بغاوت اوران کے عروج، سکھوں کی بغاوت، نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی اور معرکۂ پانی پت، سیاست ہند میں روہیلوں کی شرکت، ایرانی تورانی امراء میں بڑھتی ہوئی کشمکش، ہندوستان پر یورپی اقوام کی للچائی ہوئی نظریں اور پھر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط وغلبہ سے دلی اور حکومت دلی ہی نہیں پورا ہندوستان لرز رہا تھا۔

شاہ ولی اللہ نے اس صورت حال کو بدلنے کیلئے اول تو اپنے انقلابی پروگرام کے دو اصول متعین کئے

(الف) علمی اصلاح کے لئے قرآن حکیم کی تعلیمات پر مبنی حکمت عملی کو عنوان بنانا اور

(ب) دولت وملت کے تمام اخلاقی اور عملی مفاسد کا مرجع ومدار اقتصادی عدم توازن کو قرار دینا۔

اس کے علاوہ انہوں نے اپنے رفقاء کی مرکزی جماعت بھی تیار کی جس نے تعلیم وارشاد کے ذریعہ ایک طرف علماء اور صوفیاء میں اور دوسری طرف امراء اور اولیائے دولت میں اپنی انقلابی تحریک

کی اشاعت شروع کی۔

اس انقلابی تحریک سے دہلی کے اعلیٰ طبقے علوم سے متعارف ہوئے اور امرائے دولت کے اشتراک سے کسی قدر سیاسی کامیابیوں کے بھی آثار پیدا ہوئے لیکن نظام سلطنت کی بوسیدگی کے سبب اراکین دربار میں حکومت سنبھالنے والے تو کسی طرح پیدا ہوتے رہے مگر مرکز کو بچانے کی قوت و استعداد رکھنے والے کسی طرح پیدا نہیں ہوئے۔

شاہ ولی اللہ کے انتقال (۱۷۶۲ء) کے بعد ان کی مرکزی جماعت نے ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء- ۱۸۲۴ء) کو امام و قائد منتخب کیا جن کی عمر اس وقت تقریباً ۱۷ سال تھی۔ یہ وہ دور تھا جب کلکتہ سے دہلی تک انگریزوں کا معنوی تسلط مکمل ہو چکا تھا۔ دکن میں مراٹھے اور پنجاب میں سکھ بظاہر عروج پر تھے مگر انگریزوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے ہوئے تھے۔

شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دینے (۱۸۰۳ء) کے ساتھ (اپنے والد کے برخلاف جنھوں نے اعلیٰ طبقے کو علوم سے متعارف کرایا تھا) متوسط طبقے کو بیدار کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی مرکزی جماعت میں اپنے بھائیوں شاہ رفیع الدین (۱۷۴۹ء-۱۸۱۷ء)، شاہ عبدالقادر (۱۷۵۳ء-۱۸۱۵ء) شاہ عبدالغنی (۱۸۱۹ء-۱۸۷۸ء) کو شامل کیا اور اس جماعت کی کوششوں سے نوجوانوں کی بھی ایک جماعت تیار ہوگئی جس میں شاہ محمد اسمٰعیل شہید (ف ۱۸۳۱ء)، شاہ عبدالحئی دہلوی (ف ۱۸۲۷ء)، شاہ محمد اسحٰق (۱۸۴۵ء) اور مولانا محمد یعقوب (ف ۱۸۸۴ء) سرکردہ اہمیت و حیثیت کے حامل تھے۔

شاہ عبدالعزیز کی عمر کے آخری ایام میں ہندوستان میں سیاسی سطح پر سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کی نظر میں ان کے بعد کسی میں بھی تنہا ان کی نیابت کی صلاحیت نہیں تھی، اس لئے انہوں نے

(الف) عسکری امور کے لئے سید احمد شہید (ف ۱۸۳۱ء) کو امیر اور مولانا عبدالحئی اور شاہ محمد اسمٰعیل شہید کو ان کا مشیر مقرر کیا اور تمام جماعت کو حکم دیا کہ جس معاملے میں سید احمد (شہید)، مولانا عبدالحئی اور شاہ محمد اسمٰعیل (شہید) میں اتفاق ہو جائے یعنی تینوں جمع ہو جائیں اس کو امام جماعت شاہ عبدالعزیز کا حکم سمجھا جائے۔

(ب) تنظیمی امور کیلئے مولانا محمد اسحٰق کو امیر اور مولانا محمد یعقوب کو مشیر مقرر کیا اور کہا کہ ان کا حکم میرا حکم ہے۔

شاہ عبدالعزیز کے انتقال (۱۸۲۳ء) کے بعد ان کی مسند تدریس پر مولانا محمد اسحٰق جلوہ

افروز ہوئے اور جب سید احمد شہید کا قافلہ حج سے واپس ہوا تو انہوں نے بھی شاہ محمد اسحٰق کی امامت کو قبول کرلیا۔ اس زمانہ میں اگر جماعت ولی اللٰہی کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا تو مولانا محمد اسحٰق صدارت کرتے اور مولانا سید احمد شہید حلقہ میں بیٹھتے اور جب مدرسہ سے باہر اجلاس ہوتا تو مولانا محمد اسحٰق حلقے میں بیٹھتے اور سید احمد شہید صدر ہوتے۔ ۶؍مئی ۱۸۳۱ء کو جب شاہ ولی اللہ کی تحریک کو پورے سو برس ہوچکے تھے، ایک افغان خاندان نے، جس پر رحم کھا کر سید احمد شہید نے اس سے جنگ میں جیتی ہوئی حکومت لوٹا دی تھی حد درجہ احسان فراموشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرحدی قبائلیوں کو ورغلایا اور اس کے نتیجہ میں ہر ہر قریہ کے لوگوں نے انقلابی حکومت کے تمام سپاہیوں اور سرداروں کو ایک ہی رات میں دھوکے سے تہہ تیغ کر ڈالا۔

سید احمد شہید اس واقعہ سے اتنا بددل ہوئے کہ انہوں نے کشمیر کا رخ کیا جس کو وہ اپنا مستقر بنانا چاہتے تھے۔ بالاکوٹ راستے کی ایک منزل تھی۔ سکھوں کے ولی عہد شیر سنگھ نے حملہ کردیا اور سید احمد شہید کا سر کاٹ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ (۱۸۳۹ء) کو دکھانے کے لئے لاہور لے گیا۔ بغیر سر کے ان کی میت شاہ محمد اسمٰعیل شہید کی میت کے ساتھ بالاکوٹ میں دفن ہے۔

بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد مولانا محمد اسحٰق نے ۱۱؍سال تک غور وفکر کرکے شاہ ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مرتب کیا جس کے دو بنیادی اصول تھے۔

(الف) حنفی مذہب کی پابندی اور

(ب) ترکی سلطنت سے اتصال

تاسیس دارالعلوم دیوبند (۱۸۶۶ء)، ریشمی رومال کی تحریک (۱۹۱۶ء)[1] اور ہندوستان کی آزادی کیلئے علماء کی جدوجہد کی صورت میں یہ تحریک آگے بڑھتی رہی اور آج بھی سرگرم عمل ہے۔

انگریزوں خصوصاً ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے حریت پسند اور سامراج دشمن علماء کو ''وہابی'' لکھا ہے۔ لفظ ''وہابی'' کا استعمال ان علماء کے لئے صحیح نہیں تھا کیونکہ اُن کے سیاسی مقاصد اور عام سماجی مذہبی نظریات نجد کے شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳ء-۱۷۹۲ء) کے عقائد و نظریات سے اخذ نہیں کئے گئے تھے بلکہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر مبنی تھے۔

شاہ ولی اللہ کو بجا طور پر امام انقلاب کہا گیا ہے۔ ان کے ماننے والوں نے مسلم عوام کو بیدار کیا اور انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اس کے آلہ کار مسلمان جابروں کے جور وستم اور معاشی استحصال

۱- عام طور سے یہی سنہ لکھا جاتا ہے کیونکہ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی رومال پر لکھے ہوئے خطوط پکڑے گئے، ورنہ اس تحریک کا سلسلہ اس سے پہلے کے کئی برسوں تک پھیلا ہوا ہے۔

سے بھی نجات حاصل کرنے پر اکسایا۔تحریک ولی اللہی نے مسلم معاشرہ کے اندر طبقاتی امتیازات کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی اور اصلاح کے لئے روشن خیال طبقے کو غیر مطمئن عوام کے ساتھ متحد ہونے پر آمادہ کیا، ان کی کوششوں سے انگریزوں کے خلاف مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں میں بھی اتحاد و اتفاق کی ایک عام فضا اور ایک وسیع محاذ پیدا ہوگیا۔اس محاذ میں جائیداد سے محروم امراء، تباہ حال دستکار، حریت پسند علماء، غیر مطمئن فوجی بھی شامل تھے۔اس کے علاوہ اسی محاذ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بھی ایک ایسا مشترکہ نظام قائم کرنے کی کوشش کی جس کے بارے میں بعد میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا کہ" واقعی یہ نظام ایک بے قرار آبادی کے امید وبیم کے ساتھ ہم آہنگ تھا"۔[1]

اردو و فارسی کے مشہور شاعر مومن خاں مومن (۱۸۰۰-۱۸۵۱ء) سید احمد بریلوی کی تحریک میں شرکت اور ان سے اپنی عقیدت کے سبب دہلی کے انگریز حکام سے پہلے ہی بڑی پریشانیاں اٹھا چکے تھے لیکن اپنی بیعت پر قائم تھے۔انہوں نے اپنی اردو مثنوی کو مناجات پر ختم کرتے ہوئے مجاہدین اسلام کے ساتھ شہید ہونے کی دعا مانگی ہے۔

مشہور سماجی مصلح، ماہر تعلیم اور بانی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سر سید احمد خاں بھی، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد نئی فکر اور حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے اپنے پچھلے نظریات کی تردید کی کوشش کی، ۱۸۴۶ء تک انہیں خیالات کے حامل تھے جن کے حاملین کو انگریزوں نے" وہابی" کہا ہے۔[2]

ڈاکٹر شمس بدایونی نے راقم الحروف کے نام ایک نجی خط میں لفظ" وہابی" پر داد تحقیق دی ہے۔

> "قومی تاریخ میں لفظ" وہابی" کے استعمال پر بارہا غور کیا ہے اور اپنے متعدد مضامین میں اس پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔جہاں تک میں تلاش کر سکا ہوں اس لفظ کا پہلے پہل استعمال اہل عرب نے کیا۔شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۷۰۳ء-۱۷۹۲ء) کی برپا کردہ توحید خالص کی تحریک اور ان کے متبعین کو اول، ترکوں اور اشراف مکہ نے سیاسی پروپیگنڈے کے طور پر" وہابی" کے لقب سے مطعون کیا۔شیخ عمران نے کہا ہے:
>
> إن كان تابع احمد متوهبا
>
> فانا المقر بانني وهابي
>
> (ترجمہ: اگر احمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیروکار وہابی ہے تو مجھے اقرار ہے کہ

1. W.W.Hunter, The Indian Musalmans p.102

۲۔ تفصیل ص ۱۲۸ پر ملاحظہ کریں۔

میں وہابی ہوں۔)

ہندوستان میں مولانا فضل رسول مست قادری بدایونی (۱۷۹۸ء - ۱۸۷۲ء) پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی کتاب سیف الجبار (اردو سال تالیف ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸ء۔ مطبوعہ مطبع صبح صادق سیتاپور، ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء) میں شاہ اسمٰعیل شہید اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے درمیان فکری رابطے تلاش کیے اور اسی نسبت سے شاہ صاحب پر لفظ ''وہابی'' کا اطلاق کیا۔ ہندوستان میں لفظ وہابی کا غالبًا یہ اولین تحریری استعمال تھا جو بعد میں خاندانِ ولی اللٰہی کے دوسرے اکابر و جانشینوں پر بھی چسپاں کیا جانے لگا۔ انگریز مؤرخین نے اس لفظ کو ''باغی'' کے معنی میں استعمال کیا اور ''تحریک احیائے دین'' کو ''وہابی مومنٹ'' کا نام دے دیا۔ انگریز مصنفین میں سب سے پہلے لفظ وہابی کا استعمال ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب 'دی انڈین مسلمانز' (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) میں کیا تھا۔ اسی زمانے میں سرسید احمد خان نے اس کتاب پر پائنیر میں تبصرہ کرتے ہوئے اقرار کیا تھا کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔ (حیات جاوید ص ۱۷۸) یہ تبصرہ پائنیر کی نومبر ۱۸۷۱ء سے پیشتر کی کسی اشاعت میں شائع ہوا تھا بعد میں حافظ احمد حسن (لندن) نے پمفلٹ کی صورت میں تبصرے کو چھپوا کر تقسیم کیا۔''

فرید پور کے حاجی شریعت اللہ (ف ۱۸۴۰ء) نے ۱۸۱۸ء میں ''فرائضی تحریک'' کی بنا ڈالی۔ اس تحریک کا شرعی فرائض کی بجا آوری پر بہت زور تھا اسی لئے یہ تحریک ''فرائضی تحریک'' کے نام سے موسوم ہوگئی۔ یہ تحریک زمینداروں کو زمین سے بلا معاوضہ بے دخل کرنے کی حامی تھی اور اس سلسلے میں اس کے کارکنوں کا پہلا کام بے زمین کسانوں اور مزدوروں کو زمینداروں کی جبری وصولیابی کے خلاف دین اسلام کے اصولوں کی بنیاد پر متحد کرنا تھا۔ حاجی شریعت اللہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے دودھو میاں (ف ۱۸۵۹ء کے آس پاس) نے اس تحریک کو ارض للّٰہ یعنی زمین خدا کی ملکیت ہے کا نعرہ دیا۔ انہوں نے اس تصور کو عام کیا کہ خدا کی زمین پر کسی انسان کو ٹیکس لگانے کا حق نہیں ہے۔ نتیجتًا فرید پور، نادیہ اور ۲۴ پرگنہ کے اضلاع میں ہندو و مسلم زمینداروں اور انگریز کارخانہ داروں سے ان کے تصادم ہوئے۔ انہوں نے دیندار لوگوں کی قیادت میں دیہی عدالتیں بھی لگائیں، ان کے دائرہ اثر میں اگر کوئی اپنا مقدمہ انگریزوں کی عدالتوں میں لے جاتا تو اس کو سماج کی طرف سے مقررہ سزا دی جاتی تھی۔[1]

1. N. Chaudhary, Civil Disturbances in India p.113

اس کے بعد کے برسوں میں یعنی جنگ آزادی کی شدت کے دور میں نواب نجف خاں (ف ۱۷۸۲ء) نے نمک اور کھانڈ کے محصول موقوف کرادیے تھے اور ذخیرہ اندوزی کو قابل سزا جرم قرار دیا تھا۔ ایسے ہی اقدامات مولوی احمد اللہ (ف ۱۸۵۸ء) اور فوجی کمیٹی نے لکھنؤ میں کیے تھے۔ دلی میں حریت پسندوں کی قومی حکومت نے پانچ بیگھ زمین معافی، دائمی ملکیت کے طور پر ہر اس فوجی کے کنبہ کو عطا کرنے کی پیشکش کی تھی جو انگریزوں کے خلاف لڑائی میں جان دینے کے لئے تیار تھا۔

اس دورِ ابتلاء میں بھی ہندو و مسلمان پوری طرح متحد تھے۔ دلی کی حکومت نے ہندوؤں کی دلجوئی کے لئے گائے کا ذبیحہ ممنوع قرار دے دیا تھا اور اس کے بدلے ہندو رہنماؤں مثلاً نانا صاحب نے از روئے تشکر و تحسین، مغل حکومت کے تمام علامات و نشانات برقرار رکھے تھے۔ مثلاً سنہ ہجری کا استعمال، حکومتی مراسلات و اطلاعات میں بسم اللہ کا اندراج اور جمعہ کی عام تعطیل وغیرہ۔

اس لئے اگر ٹیپو شہیدؒ، (جنہوں نے انگریزوں کو وطن عزیز سے نکال بھگانے کے لئے پورے ہندوستان کو متحد کرنے کی کوشش کی تھی) کے عہد سے واقعات کا تسلسل کے ساتھ جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران مجموعی طور پر تمام ہندوستان بدیسی حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کی ایک ملک گیر تحریک کی تیاری کر رہا تھا۔ اس تحریک میں صرف دو قسم کے لوگ شامل نہیں تھے۔

☆ ایک وہ جو نئے نئے زمیندار ہوئے تھے۔

☆ دوسرے شہروں میں رہنے والے وہ روشن خیال لوگ جن کی دولت اور سماجی حیثیت کا تمام تر انحصار انگریزوں کی عطا پر تھا۔

غالب دوسری قسم کے لوگوں میں تھے۔ اس لئے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی ملک گیر تحریک کی تیاری کا ان کے فکر و عمل پر کوئی اثر نہیں پڑا اور وہ بدستور یہی سمجھتے رہے کہ ان کی روزی اور عزت دونوں انگریزوں سے تعلق بنائے رکھنے پر موقوف ہے۔

۱۸۲۴ء سے ۱۸۵۷ء کا درمیانی دور انگریزوں کے لئے اضطراب و بے چینی کا دور رہا ہے۔ اگرچہ اس دور میں ان کے اقتدار و اختیار میں وسعت ہوتی رہی مگر اسی دوران انہیں برما سے جنگ، سید احمد شہید کے مجاہدوں سے محاربہ، افغانوں سے زور آزمائی اور خود سکھوں سے بھی دو مختصر مقابلے پر مجبور ہونا پڑا جو ان کے پرانے رفیق اور حلیف تھے۔

غالب اس دوران ۲۵-۲۶ برس کے کڑیل جوان تھے۔ جوانی بہ ظاہر احتجاج و انقلاب کی راہ زیادہ پسند کرتی ہے مگر غالب کی زندگی کے حقائق ان کی غیرت و خودداری یا جدید ذہن و

مستقبل بنی سے متعلق خود غالب یا ماہرین غالبیات کے دعوے اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پنشن، منصب اور خلعت کے حصول کے علاوہ زندگی کے کسی اور مقصد پر انہوں نے کبھی کوئی توجہ دی ہی نہیں اور اسی کی طلب میں، اواخر نومبر ۱۸۲۵ء میں عازم کلکتہ ہوئے حالانکہ اس وقت ان کے حقیقی بھائی مرزا یوسف بیگ کی بیماری و دیوانگی کا آغاز ہو چکا تھا اور گھر میں کوئی ایسا مرد نہیں تھا جو ان کی اہلیہ کا خیال رکھتا۔

کلکتہ میں انہیں انگریزوں کی سائنسی ترقیوں کے ساتھ بنگال کے ان طبقات کو دیکھنے کا بھی موقع ملا جو برطانوی حکومت کے زیر اثر پروان چڑھ رہے تھے اور ان کی تمام تر امیدیں یورپ اور انگلستان کے متوسط طبقے کی سیاسی معاشی اور سماجی شعبوں میں کامیابیوں سے وابستہ تھیں۔

اس امید کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روشن خیال طبقے کی پشت پر ۴۰ سالہ نوآبادیاتی ''تحریکِ اصلاح'' بھی تھی۔ تحریکِ اصلاحِ مذہب (ابتداء ۱۸۱۵ء) کے بانی اگرچہ راجہ رام موہن رائے تھے مگر دیویندر ناتھ ٹیگور (۱۸۱۷ء-۱۹۰۵ء) کی قیادت میں یہ تحریک ۱۸۴۳ء تک کامیابی کے پرچم بلند کرتی رہی۔ اسی سے معاشرتی اصلاح کی تحریک نے جنم لیا جس نے ایشور چند ودیا ساگر (۱۸۲۰ء-۱۸۹۱ء) کی قیادت میں اس وقت نمایاں کامیابی حاصل کی جب ۱۸۵۶ء میں بیوہ کی شادی کا قانون پاس ہو گیا۔

اس طبقہ کے لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے ان جاگیرداروں سے، جو برطانوی حکمرانوں سے اپنا کھویا ہوا اقتدار چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں، قانونی اور آئینی حقوق حاصل کرنے کا موقع کبھی نہیں ملے گا جبکہ ان انگریزوں سے جو خود مختار کاؤنسل اور پارلیمنٹ میں عوام کے نمائندے بن کر بیٹھے ہیں، انصاف پروری اور عقلِ سلیم کا واسطہ دے کر قانونی اور آئینی حقوق حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے روشن خیال طبقے نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں سپاہیوں کی مسلح مزاحمت کو جس پر مذہبی جذبات کی گہری چھاپ تھی، ایک اتفاقیہ، جاگیردارانہ اور رجعت پسندانہ ہنگامہ سمجھ کر اس کی مذمت کی۔

غالب کا رویہ اور نظریہ بھی یہی تھا مگر تاریخ کے مطالعے کے دوران بہت ساری ایسی صورتوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے، جنہیں ہم متناقضات کا نام دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور جو بہ آسانی رد نہیں کئے جا سکتے۔ اس دوران بھی یہ متناقضات سامنے آئے۔ روشن خیال طبقے میں کوئی بھی چھوٹا بڑا شخص ایسا نہیں تھا جو ایک پل کے لئے بھی یہ بھولا ہو کہ حب وطنی بہتر وصف ہے۔ اس لئے عموماً سبھی نے بھارت ماتا کی غلامی اور حملہ آوروں کے ہاتھوں اس کی تباہی کا ماتم کیا ہے۔ البتہ ان میں سے بعض

نے حملہ آوروں میں انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً بنکم چندر چٹرجی کے ناول ''آنند مٹھ'' کا ایک کردار کہتا ہے کہ اب انگریز آ گئے ہیں وہ ہمیں مسلمانوں کے مظالم سے نجات دلائیں گے۔ لیکن انہی میں ''دی ہندو پیٹریٹ'' کے ہریش چندر مکھرجی جیسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے جنگ آزادی کے دوران ایک طرف تو حریت پسندوں کو گمراہ اور توہم پرست قرار دیا تھا اور دوسری طرف انقلاب پسندوں کی تحریک کو دبانے میں انگریزوں کو اعتدال سے کام لینے کے مشورے بھی دیئے تھے۔

اسی دور میں ''ایشور گپت'' جیسے شاعر بھی گزرے ہیں جو اس حد تک انقلاب پسند تھے کہ ان کے نزدیک ''غیر ملکیوں کے دیوتا کے بجائے اپنے وطن کے کتے کو عزیز رکھنا زیادہ بہتر تھا۔'' اور ایسے ہی شاعروں، دانشوروں اور بیدار ذہن لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی آخری رات ختم ہونے سے پہلے ہی بنگال کا وہی روشن خیال طبقہ جو پہلے انگریزوں کو اپنے مفادات کا نگراں اور اپنی اصلاحی تحریکوں کا روح رواں سمجھتا تھا، وسطی بنگال کی 'بغاوتِ نیل' میں بلا تامل کود پڑا اور مظلوم کسانوں کی بہبودی کے لئے پورے جوش و خروش کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

غالب زندگی کے کسی بھی مرحلے میں ایسی کسی تبدیلی سے دوچار نہیں ہوئے۔ وہ نہ صرف آخری سانس تک انقلابی احساسات سے عاری رہے بلکہ بنگالی ادب کے اس تخلیقی کرب کو بھی محسوس نہیں کر سکے جس میں وہ ۱۸۵۶ء اور ۱۸۶۱ء کے دوران مبتلا تھا۔ اس سے پہلے یہ تیاری کے چار ادوار سے گزر چکا تھا۔

فورٹ ولیم دور

راجہ رام موہن رائے دور ۳۱-۱۸۱۵ء

نوجوان بنگال اور سم واد پربھاکر دور ۴۳-۱۸۳۱ء اور

آخر میں ودیا ساگر تتو بودھنی پتریکا دور ۵۶-۱۸۴۳ء

آخری دونوں دور غالب کی جوانی کے ایام پر محیط ہیں مگر ان کی نگاہیں کلکتہ اور بنگال کے چہرے پر انگریزوں کے ملے ہوئے غازے سے آگے نہیں دیکھ سکیں۔ وہ انقلابی بنگال کی اس روح کو بھی نہیں پہچان سکے جو بنگال کی انقلابی اور قومی تحریکوں کی محرک بنی، نہ ہی انہوں نے ۱۸۵۷ء کے خاکستر میں چھپی چنگاریوں کی گرمی محسوس کی جو بعد میں ریشمی رومال، دیوبند اور دوسری قومی و انقلابی تحریکوں کی صورت میں شعلہ جوالہ بن کر غلامی کی زنجیروں کو پگھلا دینے کا سبب بنیں۔ یعنی غالب نے اپنے عہد کے مذہبی احیاء پسندوں، انقلابیوں اور حریت پسندوں کی ان دیکھی، ان سنی تو کی ہی

اپنے زمانے کے روشن خیال طبقے اور اہل قلم کے حقیقی احساسات اور تخلیقی کرب کو بھی نہیں سمجھ سکے۔

غالب کے دفاع میں کہا جا سکتا ہے کہ ایک ۶۰-۶۱ برس کے بوڑھے اور آفت رسیدہ شاعر سے جو نہ صرف نئے حکمرانوں کی نظروں میں مشتبہ تھا بلکہ جس کے خلاف دربار شاہی سے کوچہ ہائے دلی تک مخبروں کا جال بھی بچھا ہوا تھا، کیا توقع کی جا سکتی تھی؟ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں جب دلی کے بے شمار شرفاء جیلوں میں تھے یا قتل کر دیئے گئے تھے یا جھوٹے سچے مقدمات میں ملوث تھے؟ غالب نے جو طے کیا اس سے ان کے لئے کم از کم چند سالہ عافیت کا سامان تو ہو گیا!

اس کے علاوہ یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ غالب نے جا بجا یہ اشارے دیئے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے خوف کے سبب نہیں لکھ سکتے تھے مثلاً ان کا یہ خط:

> ''منہ پیٹتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں نہیں لکھ سکتا۔ الٰہی حیات جاودانی نہیں مانگتا، انورالدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں، پھر اس کے بعد مروں''۔[1]

یا یہ کہ بے قصور موت کے گھاٹ اتار دیئے جانے والوں کا ماتم کرتے ہوئے انہوں نے ذلت کی زندگی پر عزت کی فطری موت کو ترجیح دیتے ہوئے بڑی سچی بات لکھی ہے کہ

> ''نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟''[2]

مگر اس عہد کے حالات اور غالب کے کردار کے سامنے ان میں سے کوئی استدلال بھی پائیدار نہیں ثابت ہوتا کیونکہ مصلحت و مجبوری اور کمزوری کس کے ساتھ نہیں ہے؟ اگر تمام لوگ غالب کا طرز عمل اختیار کر لیں تو دنیا میں ظلم کے خلاف مزاحمت کے تمام سلسلے ختم اور انقلاب کے تمام سوتے خشک ہو جائیں۔ ۱۸۵۷ء میں بھی جن لوگوں نے انگریزوں کے خلاف کلمۂ حق بلند کیا تھا یا تلواریں اٹھائی تھیں، ان میں سے بہتوں کے حالات غالب سے بہتر نہیں تھے۔ اگر وہ بھی غالب ہی کا انداز فکر اختیار کر لیتے تو انقلاب کا بگل بجتا، نہ ملک آزاد ہوتا۔

غالب کی کسی تحریر یا عمل سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ایک پل کے لئے بھی انہوں نے عزت کی زندگی کیلئے ملک کی آزادی کو ضروری سمجھا ہو حالانکہ ان کے سامنے احیاء پسند مجاہدین اور حریت پسند

۱۔ غالب بنام انورالدولہ شفق، اگست-نومبر ۱۸۵۸ء

۲۔ غالب بنام یوسف میرزا، جون۔ جولائی ۱۸۵۹ء

سپاہیوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو انگریزوں سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے باوجود ان کی مخالفت یا ان سے بیزاری کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

مثال کے طور پر مفتی صدرالدین خاں آزردہ (ف ۱۸۶۸ء) اگرچہ انگریزوں کی ملازمت میں تھے مگر جذبہ حریت سے بے نیاز نہیں تھے۔ انہوں نے اس فتویٰ جہاد پر دستخط بھی کئے تھے جو انگریزوں کے خلاف علماء کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ مؤلف خم خانہ جاوید جلد ا، ص ۵۴ کی روایت کے مطابق یہ لطیفہ زبان زدِ خاص و عام تھا کہ جب انگریزوں نے انہیں گرفتار کیا تو انہوں نے صفائی دی کہ میں نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ مجھ سے 'بالجبر' دستخط لئے گئے ہیں۔ مولانا نے دستخط سے پہلے 'بالخیر' لکھا تھا۔ نقطہ نہ ہونے کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے 'بالحر' کو 'بالجبر' ثابت کیا اور جان چھڑائی[۱]، البتہ ان کی جائیداد اور املاک کا بڑا حصہ ضبط کرلیا گیا۔ غالب کی زندگی میں ایسا کوئی مرحلہ کبھی نہیں آیا۔ ان پر بہادر شاہ ظفر کے لئے ایک سکہ کہنے کا الزام تھا وہ بھی غلط تھا۔ وہ آخری سانس تک انگریزوں کی خوشامد ہی کرتے رہے۔

غالب نے اپنے دادیہال اور نانیہال میں پشتہا پشت سے سپہ گری کے پیشہ کا ذکر کرتے ہوئے بڑے فخر سے کہا ہے کہ ع

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کے آباء کا وہ پیشہ جس پر انہیں بڑا فخر تھا صرف دو پشت چل سکا تھا اور اس کے بعد ان کے لئے ذریعہ عزت اگر کوئی چیز رہ گئی تھی تو وہ صرف شاعری تھی۔

'مہر نیم روز' کے دیباچے میں ایک رباعی میں انہوں نے بڑی خوبصورتی سے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے اجداد کا ٹوٹا ہوا تیر ان کے لئے قلم بن گیا ہے۔

غالب بہ گرزدودۂ زادشم
زاں رو بہ صفائے دم تیغ است دم

۱- اب وہ استفتاء اور اس کا جواب منظر عام پر آچکا ہے جس کے متعلق "بالحر" کو بالجبر" ثابت کرنے کا لطیفہ گھڑا گیا تھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے دستخط میں واضح طور پر اپنا نام لکھا ہے اس کے ساتھ کوئی اور لفظ یا جملہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو پروفیسر محمد ایوب قادری کی کتاب "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (کراچی ۱۹۷۶ء) کے صفحہ ۴۰۲ پر "جہاد کا فتویٰ اور اس کے مفتیانِ کرام" اور صفحہ ۵۶۷ پر "مولوی سید فضل حق شاہجہاں پوری ثم رام پوری"۔ سید خورشید مصطفےٰ رضوی نے بھی اپنی کتاب "تاریخ جنگ آزادی ہند...." رام پور رضا لائبریری، کے ص ۳۴۸ پر اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔

چوں رفت سپہدی زدم جنگ بہ شعر
شد تیر شکستہ نیاگاں قلم

لیکن عملاً انہوں نے انگریزوں کے خلاف کبھی تلوار اٹھائی نہ قلم، بلکہ یہ لکھ کر ان کے حق میں دعائے خیر ہی کرتے رہے کہ "انگریزوں نے شمع تو گل کر دی لیکن صبح صادق کی بشارت دے دی ہے جو آمد آفتاب کا پیش خیمہ ہے۔" حالانکہ خود انگریزوں کے خیال میں غالب کا وہ بیان جھوٹا تھا جس کو انہوں نے "بشارت" بنا کر پیش کیا تھا کیونکہ انہیں اپنی حکومت کے استحکام کے سلسلہ میں کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ نہ ہی وہ اپنے ان مظالم کو بہت دنوں تک چھپا سکے جو انہوں نے ہندوستانیوں پر ڈھائے تھے۔ شور کا یہ اعتراف تاریخ میں محفوظ ہے کہ

"ہماری سلطنت ریت کے ایک جزیرے کی مانند ہے جسے کسی سیلاب نے ابھارا ہے۔ نہ تو بند باندھے گئے ہیں اور نہ ہی ایسے درخت لگائے گئے ہیں جن کی جڑیں نیچے پھیل کر ایک دوسرے کو جکڑ لیں۔"[1]

اس کے علاوہ جنگ آزادی کے دوران کارل مارکس اور دوسرے انقلاب پسندوں نے بھی انگریزوں کو احساس دلا دیا تھا کہ

"آہستہ آہستہ ایسے راز فاش ہو جائیں گے جن کی بنیاد پر خود جان بل کو اس بات کا یقین ہو جائیگا کہ جسے وہ ایک فوجی غدر تصور کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قومی بغاوت ہے۔"[2]

لہٰذا دیسی حکمرانوں کی مدد سے ۱۸۵۷ء کی قومی جنگ کو دبانے کے باوجود انگریزوں نے اطمینان کی سانس نہیں لی کیونکہ انہیں احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستانیوں میں جذبۂ قوم پرستی اور انقلاب دوستی کی جو امنگ پیدا ہو چکی ہے، وہ انہیں اس ملک پر زیادہ دنوں حکومت کرنے نہیں دے گی۔ اس لئے ایک طرف تو ملکہ وکٹوریہ نے کاروبارِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے کر (یکم نومبر ۱۸۵۸ء) ہندوستانی عوام کو یقین دہانی کرانے کی کوشش کی کہ

"سوائے ان لوگوں کے جو ہماری انگریز رعایا کے قتل میں حصہ لینے کے مجرم ہیں، باقی جو لوگ بھی اسلحے رکھ دیں گے ان سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ہندوستانیوں کی گود لینے کی رسم آئندہ سے جائز سمجھی جائے گی اور گود

۱۔ شور Notes ص ۱۲۶

۲۔ کارل مارکس۔ (مقالہ بے دستخط) ۱۴ راگست ۱۸۵۷ء نیو یارک ڈیلی ٹریبون

لئے لڑکوں کو باپ کی جائیداد اور گدی کا مالک مانا جائے گا۔ کسی کے مذہبی عقیدوں یا مذہبی رسم و رواج میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ہندوستانی والیانِ ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہد نامے کئے ہیں ان کی تمام شرطوں پر آئندہ ایمانداری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی رئیس کی ریاست یا اس کا کوئی حق نہیں چھینا جائے گا۔ سارے ہندوستانیوں کے ساتھ ٹھیک اسی طرح کا سلوک کیا جائے گا جس طرح انگریزوں کے ساتھ۔''[1]

اور دوسری طرف ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت ہندوستان کے مختلف طبقوں اور فرقوں میں نفاق ڈالنے کی منصوبہ بند کوششیں بھی شروع کردیں۔[2] تاکہ ہندوستانیوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے متحدہ قومیت اور بدیسی حملہ آوروں کو اپنی سرزمین سے کھدیڑ دینے کے احساسات کو ختم کرسکیں لیکن اس مرتبہ ان لوگوں نے بھی انہیں جھڑک دیا جو پہلے ان کے دام فریب میں پھنس چکے تھے۔

پہلے تو بیگم حضرت محل نے عوام کو خبردار کیا کہ

''اس اعلان میں لکھا ہے کہ عیسائی مذہب سچا ہے، لیکن کسی اور مذہب والوں کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے گی اور سب کے ساتھ ایک طرح کا قانونی برتاؤ کیا جائیگا۔ سچے نظامِ حکومت میں کسی مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کیا تعلق ہے؟

سوّر کھانا اور شراب پینا، چربی کے کارتوس دانت سے کاٹنا اور آٹے اور مٹھائیوں میں سوّر کی چربی ملانا، سڑکیں بنانے کے بہانے مندروں اور مسجدوں کو گرانا، گرجا بنانا، گلیوں اور کوچوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے کے لئے پادریوں کو بھیجنا، ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے لوگ کیسے یقین کرسکتے ہیں کہ

۱۔ اس سلسلہ میں ہندوستانیوں اور برطانوی مصنفین کی کئی کتابیں ہیں جن سے تفصیلی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔
(الف) پنڈت سندر لال۔ سنہ ستاون
(ب) Charles Bull- History of the Indian Mutiny خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔
۲۔ Stratchy's letter to secratary of state qouted from
Dr. N.L.Gupta - Nehru and Communalism

ان کے مذہب میں دخل نہ دیا جائے گا؟

اس اعلان میں لکھا ہے کہ.........جن لوگوں نے قتل کیے ہیں یا قتلوں میں مدد دی ہے، ان پر کوئی رحم نہ کیا جائے گا، باقی سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ایک بے وقوف آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس اعلان کے مطابق قصوروار یا بے قصور کوئی آدمی بھی نہیں بچ سکتا۔.....ایک بات اس میں صاف کہی گئی ہے وہ یہ کہ کسی بھی قصوروار آدمی کو نہ چھوڑا جائے گا۔ اس لئے جس گاؤں یا علاقے میں ہماری فوج ٹھہری ہے، اس کے باشندے نہیں بچ سکتے......اس اعلان کو پڑھ کر جس میں کہ صاف دشمنی بھری ہوئی ہے، ہمیں اپنی رعایا کی حالت پر بہت افسوس ہے۔

اب ہم ایک صاف اور معتبر فرمان جاری کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں سے جن لوگوں نے بے وقوفی کر کے گاؤں کے مکھیوں کی حیثیت سے اپنے آپ کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ پہلی جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں آ کر حاضر ہوں، بلا شبہ ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا.....آج تک کبھی کسی نے نہیں دیکھا، کہ انگریز نے کسی کا قصور معاف کیا ہو۔

ہماری رعایا میں سے کوئی انگریزوں کے اعلان کے دھوکے میں نہ آئے۔"[1]

اور پھر چند کو چھوڑ کر وہ علماء بھی انگریزوں کے خلاف کھل کو بولنے لگے جو سید احمد شہید کی تحریک سے متفق نہ ہونے، شاہ اسمٰعیل شہید کے بعض اعتقاد یا معمول سے اختلاف رکھنے، برطانوی حکومت میں ملازم ہونے یا کسی اور مصلحت سے تحریک آزادی سے دور تھے۔

غالب کے قریبی دوست مولانا فضل حق خیرآبادی (ف ۱۸۶۱ء) اور غالب کی گرفتاری پر خوشی سے بغلیں بجانے والے مولانا محمد باقر (ف ۱۸۵۷ء) ایسے ہی علماء میں تھے جن کا انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنا ثابت نہیں ہے۔ مولانا باقر نے دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر کو چار دنوں تک پناہ دی تھی، اس کے باوجود اسی کے دیئے ہوئے رقعہ کے سبب ایک احسان فراموش انگریز افسر نے انہیں گولی مار دی تھی۔

مولانا فضل حق کے فتویٰ جہاد کی بڑی تشہیر کی گئی ہے لیکن مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور مالک

۱۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیل کے لئے اودھ کی تاریخ اور بیگم حضرت محل کے فرمانوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

رام نے نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے نام لکھے ہوئے غالب کے ایک خط اور اصل مقدمہ کے کوائف اور دستاویزی شہادتوں کی بنیاد پر ثابت کر دیا ہے کہ

☆ مولانا نے کبھی کوئی ایسا فتویٰ دیا ہی نہیں تھا جس میں مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی ہو۔

☆ غلط فہمی کی بنیاد پر انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے جو مقدمہ چلایا اس کے دوران وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا اور فتویٰ جہاد پر جن علماء کے دستخط ہیں ان میں میرا نام نہیں ہے۔

☆ مولانا نے اپنی پیرانہ سالی، اولاد کی کمسنی اور عسیر الحالی کی دہائی دے کر انگریزوں سے رحم کی پرزور التجا بھی کی ہے[1]

کالی داس گپتا رضا نے بھی اپنے ایک مضمون میں ذرا سے فرق یا بدلی ہوئی زبان میں مولانا عرشی اور مالک رام کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "اب صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک مولانا فضل حق خیر آبادی اور ان کے مقدمے اور آخرکار کالے پانی کی سزا کا تعلق ہے، عام روایتیں نادرست ہیں۔ عرشی صاحب اور مالک رام صاحب نے ایمانداری سے تحریری شہادتیں پیش کر کے ثابت کر دیا کہ مقدمے کے دوران اور اس کے بعد انتقال (۱۸۶۱ء) تک مولانا نے صورت حال کا جیسا بھی مقابلہ کیا اسے بہادرانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح اس عرصہ میں انہوں نے جو بھی بیان دیئے وہ متہورانہ [بہادرانہ] بیانات میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ تاہم میری ذاتی رائے ہے کہ مقدمے اور بعد کے رویے سے قطع نظر جو میرے خیال میں مولانا نے اپنی جان بچانے اور رہائی حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا تھا، وہ جنگ آزادی سے پورے پورے متاثر تھے۔ انہوں نے اس جنگ آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا ہو کہ نہ لیا ہو لیکن وہ جذباتی طور پر جنگ آزادی سے قطعی ہم آہنگ تھے۔"[2]

موصوف نے اپنے موقف کی دلیل میں مولانا کے اکتوبر/نومبر ۱۸۵۷ء میں لکھے ہوئے

۱۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد، تحریک، دہلی اگست ۱۹۵۷ء
مالک رام، مولانا فضل حق خیر آبادی، تحریک، دہلی جون ۱۹۶۰ء

۲۔ کالی داس گپتا رضا۔ غالبیات۔ چند عنوانات، ص ۱۱۴

ایک عربی قصیدہ کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔اس میں دین عیسوی کو مسلط کرنے، عہد و پیمان سے مکر جانے، ظلم وطغیان میں حد سے گزر جانے، صناعوں اور کاشتکاروں کا رزق چھین لینے، کمینوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور لغویات ومکروہات کی تعلیم دینے والے مدارس کھولنے کے سبب انگریزوں کی مذمت نیز کمزور و بزدل بہادر شاہ کی غیر مستقل مزاجی، عزم وصلاحیت کی کمی اور اس کے اردگرد جمع ہونے والوں کی لوٹ کھسوٹ، زنا کاری اور دھینگا مشتی سے بیزاری کے ساتھ اگرچہ ان سپاہیوں کی تعریف کی گئی ہے جنہوں نے انگریزوں سے اسلحے چھین کران کی اچھی خبر لی تھی، ساتھ ہی لشکر دہلی کے ان مٹھی بھر مخلص مجاہدین کی بھی تعریف کی گئی ہے جو بے سروسامانی میں محض رضائے الٰہی کے لئے لڑ رہے تھے مگر خود مولانا کے جنگ آزادی میں شریک ہونے، مجاہدین کی مدد کرنے یا انگریزوں کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔اس لئے اس قصیدہ کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کا قلب وضمیر مجاہدین آزادی کے ساتھ تھا اور خدمات انگریزوں کے لئے۔

کالی داس گپتا رضا کا شائع کیا ہوا قصیدہ دلی کی تاراجی کے بعد مولانا کے دلی سے نکل کر منزل (خیر آباد) تک پہنچنے کے احوال پر مشتمل ہے۔اس باب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر مولانا کے شہرۂ آفاق رسالہ ''الثورۃ الہندیہ'' اور دو عربی قصائد کے اردو ترجمے پیش کیے جارہے ہیں جن کی تخلیق نہایت کسمپرسی میں جزیرہ انڈمان میں ہوئی تھی۔یہ رسالہ اور دونوں قصائد درد وکرب اور جذب وتاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں، اگرچہ ان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو انگریزوں کے خلاف جہاد آزادی میں ان کی عملی شرکت کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکے۔

انہوں نے جہاد آزادی میں عملی شرکت کی بھی نہیں تھی، جہاد کے فتوے پر ان کا دستخط کرنا بھی قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ وہ ۱۵راگست ۱۸۵۷ء کو الور سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔تب تک نہ صرف فتویٰ مشتہر ہو چکا تھا اور اس کے اثرات مرتب ہو چکے تھے بلکہ انگریز دوبارہ دلی پر قبضہ کرنے کی تیاریوں میں تھے۔ ۲۰ر ستمبر کو ان کا دلی پر مکمل قبضہ بھی ہوگیا۔اس لئے بالآخر انگریزوں نے بھی ان کی بے گناہی تسلیم کرتے ہوئے ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا لیکن جب ان کا پروانۂ رہائی انڈمان پہنچا جہاں وہ قید تھے تو وہ قفس عنصری سے ہی رہائی پا چکے تھے (۱۸۶۱ء)۔وہاں پروانۂ رہائی لے جانے والے نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔مولانا نے جنگ آزادی میں شرکت کی ہوتی تو انگریز ان کی بے گناہی کیوں تسلیم کرتے؟ وہ بے گناہ تھے لیکن بے گناہی کے باوجود جب ابتلاء و آزمائش میں مبتلا کیے گئے تو انہوں نے انگریزوں کی مذمت شروع کر دی۔انہیں آزادی کی قدر

و قیمت کا احساس اس وقت ہوا جب وہ دلی سے بھاگنے یا سزا پا کر جزیرۂ انڈمان جانے پر مجبور کیے گئے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ جذباتی طور پر جنگ آزادی سے قطعی ہم آہنگ تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر مولانا فضل حق خیر آبادی انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شریک نہیں تھے یا انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ نہیں دیا تھا تو وہ گرفتار کیوں کیے گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گرفتاری اور جلا وطنی کے بعد انگریزوں کا ان کے لئے پروانۂ رہائی جاری کرنا اس حقیقت کی دلیل ہے کہ وہ مطمئن ہو چکے تھے کہ مولانا کو سنائی گئی سزا غلط تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ نام اور عہدے میں مشابہت کے سبب انہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والے ایک اور صاحب تھے جن کا نام مولوی سید فضل حق تھا۔ یہ فضل حق شاہجہاں پوری ثم رام پوری کے نام سے مشہور ہیں۔ جس وقت عدالت میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے مقدمے کی سماعت چل رہی تھی اس وقت کے اخبارات میں مولوی سید فضل حق کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی خبریں بھی جگہ پا رہی تھیں۔ یہی نہیں مولوی سید فضل حق کی ہی مجاہدانہ سرگرمیاں مولانا فضل حق خیر آبادی کے سر منڈھ دی گئی تھیں جس کے سبب انہیں کالے پانی کی سزا سنائی گئی تھی۔

مولوی سید فضل حق، شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں تھے۔ انہوں نے سید سیادت علی بانسوی (نبیرہ شاہ عبدالرزاقؒ) سے بیعت کی تھی۔ ان کے جد ابواسحاق ابراہیم حموی گیلانی مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہد میں شاہجہاں پور میں بس گئے تھے۔ اسی خاندان کے کچھ لوگ رام پور میں بھی آباد ہو گئے تھے۔ مولوی سید فضل حق کے والد کا نام سید عبداللہ تھا اور وہ نواب احمد علی خاں کے زمانے میں رام پور میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم رامپور اور شاہجہاں پور دونوں شہروں میں پائی تھی۔ فراغت کے بعد وہ رامپور میں نائب سررشتہ دار محکمہ صدر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور بریلی کمشنری میں پہلے سررشتہ دار، پھر تحصیل دار ہو گئے تھے لیکن جنگ آزادی کا بگل بجتے ہی وہ اس میں کود پڑے تھے۔ نینی تال اور پیلی بھیت میں مجاہدین نے جو معرکے کیے وہ ان میں شریک تھے۔ انقلابی حکومت کی طرف سے عہدیدار بھی ہوئے۔ سقوط بریلی کے بعد شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ لڑتے رہے۔ جھانسی کے کسی معرکے میں شہید ہوئے۔[1]

علامہ فضل حق خیر آبادی کے نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے نام ایک خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا قلق تھا کہ سید فضل حق کی سرگرمیاں ان کے لئے مصیبت بنتی جا رہی ہیں۔

۱۔ احمد علی خاں شوق، تذکرہ کاملانِ رامپور، دہلی، ۱۹۲۹ء، ص ۳۲۰

خط کے الفاظ یہ ہیں :

’’فدوی را بعلت نوکری خان بہادر خاں و نظامت پیلی بھیت و چکلہ داری محمدی وافسری لشکر باغی ماخوذ کردہ اند حالانکہ فدوی ازیں ہر سہ امر محض بری است و منشاء مواخذہ آنست کہ شخصے میر فضل حق نام از سادات شاہ جہاں پور، کہ قبل ازیں در سرکار ابد قرار بندگان عالی ملازم ماندہ سرشتہ داری پیلی بھیت ماخوذ شدہ و زمانے تحصیلدار آنولہ و پیلی بھیت ماندہ بود در ابتلائے غدر از طرف خاں علی خاں چکلہ داری محمدی شدہ پس از زمانے بافسری کدامی لشکر باغی ہمراہ فیروز شاہ آں طرف جمن فرار کرد، عزیزان اودر سرکار کمپنی بعہد ہائے جلیلہ ماموراند چنانچہ برادر حقیقی او مولوی مبین ڈپٹی کلکٹر سہارن پور بود، مہتممان اخبار خانہ خراب ناواقف ازیں تفصیل کہ او شخصے دیگر است و فدوی از شیوخ خیرآباد شخصے دیگر در اخبار نامہا حال نظامت پیلی بھیت و محمدی و افسر لشکر و فرار او با فیروز شاہ آں طرف جمن نوشتہ بعض

کہ برادر حقیقی او در سرکار مہاراجہ پٹیالہ نوکر و برادر دیگرش در سہارنپور ڈپٹی کلکٹر است و حاکمان اینجا باشتباہ ہمان مولوی فصل حق کہ ہم نادر بعضے علامات شریک فدوی است فدوی را محض بے جرم مقید کردہ اند‘‘[1]

علامہ خیرآبادی نے اپنے بیان میں بھی یہی بات دوہرائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

’’فضل حق ایک اور شخص کا نام ہے مجھے اس کی جگہ گرفتار کر لیا گیا ہے وہ آجکل (شاہزادہ) فیروز شاہ (ابن بہادر شاہ)[3] کے ساتھ ہے یہ (فضل حق) سابق میں آنولہ کا تحصیلدار تھا اور اس نے خان بہادر خاں اور بیگم (حضرت محل) کی ملازمت بھی کی ہے وہ ذات کا سید اور شاہجہان پور کا رہنے والا ہے۔‘‘[2]

بعض گواہوں نے بھی یہی بیان دیا تھا:

مولانا غلام رسول مہر نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ انہی کے لفظوں میں :

۱-ملاحظہ ہو ’’تحریک‘‘ دہلی، اگست ۱۹۵۷ء

۲-ماہنامہ ’’تحریک‘‘ دہلی، جون ۱۹۶۰ء

۳-شہزادہ فیروز شاہی خاندان سے تو تعلق رکھتا تھا مگر اس کا بہادر شاہ ظفر کا بیٹا ہونا جیسا کہ کئی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے غلط ہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کے مطابق فیروز شاہ عالم مرزا ناظم بخت کا بیٹا، شاہ عالم ثانی کا پوتا اور فرخ سیر کا نواسہ تھا۔ (غدر کے چند علماء، دہلی، ص ۱۱۵)

"مولانا فضل حق خیر آبادی جن پر غلطی سے ایک ہم نام کے دھوکے میں مقدمہ قائم ہوا اور حبس دوام... سزا ملی[1]

مولانا فضل حق خیر آبادی کے علم و فضل سے انکار ممکن نہیں ہے۔ وہ ایک قابل قدر شخصیت کے مالک تھے۔ عقیدے میں شاہ اسمٰعیل شہید سے ان کا اختلاف بھی دلائل کی بنیاد پر تھا لیکن چونکہ گرفتاری اور ابتلاء و آزمائش میں مبتلا ہونے سے پہلے جنگ آزادی میں ان کی شرکت یا جہاد کے فتوے پر ان کے دستخط کی روایتیں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں اس لئے ان کو قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔ مالک رام[2]، مولانا عرشی[3] اور پروفیسر محمد ایوب قادری[4] نے مضبوط دلائل کی بنیاد پر مولانا فضل حق کا جنگ آزادی میں شریک نہ ہونا ثابت کیا ہے۔ ان کے جواب میں حکیم محمود احمد برکاتی[5] اور راجا غلام محمد[6] نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ روایتوں کا مجموعہ ہیں۔ ان سے تحقیق کرنے والے ذہن کی تشفی نہیں ہوتی۔ مناظرانہ طرزِ تحریر، حقیقت کی مدلل بازیافت کی جگہ نہیں لے سکتی۔

مناظرانہ جوش میں راجا غلام محمد نے اپنی کتاب میں جو روایتیں جمع کردی ہیں ان میں سے بعض مولانا فضل حق خیر آبادی کے بجائے مولوی سید فضل حق کے انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے پر شاہد ہیں۔ یہی بات مولانا فضل حق نے والی رام پور کے نام اپنے خط اور عدالت میں دیئے گئے اپنے بیان میں بھی کہی تھی۔ راجا غلام محمد کی کتاب ''امتیازِ حق'' کے صفحہ ۵۴ پر گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کے نام اودھ کے چیف کمشنر کے سکریٹری کے لکھے ہوئے ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء کے مراسلے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جو فضل حق انگریزوں سے نبرد آزما تھے وہ شہزادہ فیروز شاہ کے رفیق کار تھے۔ سکریٹری کے لفظوں میں:

> ''............ فیروز شاہ، ککر شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمن جان ہے حالانکہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کئے تھے۔''

۱- مولانا غلام رسول مہر، خطوط غالب، جلد دوم، ۱۹۶۹ء، ص ۶۱۲

۲- مالک رام، مولانا فضل حق خیر آبادی، تحریک، دہلی، جون ۱۹۶۰ء

۳- مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد، تحریک، دہلی، اگست ۱۹۵۷ء

۴- محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات)، کراچی، ۱۹۷۶ء

۵- حکیم محمود احمد برکاتی، فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون، کراچی

۶- راجا غلام محمد، امتیازِ حق، مبارکپور، ۱۹۸۰ء

کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ایک مخبر کی کارستانی کے سبب استاد ذوق کے ایک شاگرد ویران کا لکھا ہوا ایک سکہ غالب کے سر منڈھ دیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مرتے مرتے مر گئے مگر وہ خلعت و پنشن نہیں حاصل کر سکے جو انہیں مطلوب تھی۔ اسی طرح مولانا فضل حق خیر آبادی، سید فضل حق شاہجہاں پوری سے محض نام کی مشابہت کی بنا پر گرفتار و جلاوطن کر دیے گئے اور انگریزوں نے ان کی بے گناہی قبول کرتے ہوئے پروانہ رہائی جاری بھی کیا تو اس وقت جب ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرنے والی تھی۔ غالب اور مولانا فضل حق خیر آبادی دونوں ہی اپنے ممدوح (انگریزوں) کے ستائے اور ناکردہ گناہی کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے مگر تخلیقی سطح پر ان کی محرومیوں کے الگ الگ اثرات مرتب ہوئے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی نے انگریزوں کی مذمت میں قصائد لکھے اور غالب نے اپنی ذہانت و طباعی کا رخ ان جملوں، لفظوں اور فقروں کی تخلیق کی طرف موڑ دیا جو ان کے خطوط کی روح ہیں۔ دونوں کے طرز عمل میں یہ فرق کیوں ہے؟ یہ سوال غالبیات سے باہر نہیں ہے۔ اس پر غور و فکر کا سلسلہ دراز ہوگا تو ویراںؔ اور سید فضل حق شاہجہاں پوری جیسی پس پردہ شخصیتوں کے حالات کے ساتھ غالبؔ اور ان کے ہم نشینوں کے درمیان ذہن و ظرف کا فرق بھی واضح ہوگا۔

کالی داس گپتا رضاؔ سے ایک جگہ اور بھی سہو ہوا ہے۔ انہوں نے مولانا فضل حق کو ''حامیان تقلید'' کا اور مولانا سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کو ''عدم تقلید'' اور ''وہابیت'' کا علمبردار لکھا ہے۔[1] لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہید غیر مقلد ہونے کے معنی میں نہ تو وہابی تھے نہ حامیانِ تقلید کے مخالف۔ وہ حنفی، مقلد اور سلسلۂ تصوف میں بیعت و ارادت سے عملی اعتقادی تعلق رکھنے والے لوگوں میں شامل تھے۔ ان کے پیروکاروں کی زبردست اکثریت بھی حنفی اور صاحب سلسلہ تھی۔[2]

شاہ اسمٰعیل شہید کے غیر مقلد ہونے کی بات بھی اگرچہ شہرت پا چکی ہے مگر حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ تقلید شخصی میں تشدد اور تقلید فقہی پر اصرار کے خلاف تھے اور بہت سے مسائل میں غیر حنفی فقہ پر بھی عمل کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبیداللہ سندھی کی یہ شہادت موجود ہے کہ

''امام ولی اللہ اگرچہ اپنے والد کی طرح حنفی مذہب کے پابند تھے مگر حنفی

۱۔ کالی داس گپتا رضا، غالبیات۔ چند عنوانات، ص ۱۱۱

۲۔ سید احمد شہید کے نسب اور اعتقاد و معمول کے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب ''سیرت سید احمد شہید'' سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اور شافعی دونوں مذہبوں کی کتابیں محققین کی طرح پڑھاتے تھے، انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے احوال حکمت کے موافق حدیث کی شرح لکھی ہے۔ اس میں بعض اوقات وہ شافعی مذہب کو، اگر وہ حدیث اور حکمت کے زیادہ موافق ہو راجح قرار دیتے ہیں۔

جب مولانا اسمٰعیل شہید نے حجۃ اللہ البالغہ امام عبدالعزیز سے پڑھی تو اپنے جدامجد کے طریقہ پر عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرے اور وہ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ سنن پر عمل کرتے تھے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم ان پر اعتراض نہیں کر سکا۔

جب افغانی علاقہ میں ہجرت کا فیصلہ ہوا تو امیر شہید نے مولانا اسمٰعیل شہید سے دریافت کیا کہ مولانا! آپ رفع یدین کیوں کرتے ہیں؟ مولانا نے کہا رضاء الٰہی حاصل کرنے کے لئے۔ امیر شہید نے کہا مولانا اب رضائے الٰہی کے لئے رفع یدین کرنا چھوڑ دیجئے۔ اس کے بعد مولانا شہید کی خاص جماعت نے بھی ان کی اطاعت میں یہ اعمال چھوڑ دیئے۔ مگر وہ لوگ جو نجدی اور یمنی علماء کے شاگرد تھے باز نہ آئے اور انہیں لوگوں کے بے جا اصرار نے مشکلات پیدا کر دیں۔ امیر شہید نے ان کے رہنما کو جو محمد اسمٰعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد اور زیدی شیعہ تھا، اپنی جماعت سے نکلوا دیا مگر فساد کی آگ پھر بھی بھڑکتی رہی [1]۔

۱۔ مولانا عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۵۹۔ ۱۶۲، ہمارے ایک بزرگ اور قابل احترام محقق نے میرے نام ایک خط میں لکھا کہ وہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو معتبر راوی نہیں مانتے۔ راقم الحروف کے نزدیک مولانا سندھی کے بیان کو نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک دوسرے مسلک کے لوگوں کو اصرار ہے کہ ''تقویۃ الایمان'' کے مصنف کو غیر مقلد ہی کہنا چاہئے۔ راقم الحروف کا موقف یہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل کے مسلک کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے ان کی دوسری تحریروں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً صراطِ مستقیم کو جس کا پہلا اور چوتھا باب انہوں نے ہی لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عہد غالب مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں احیاء دین کے علاوہ علوم و تہذیب کے نشاۃ ثانیہ کا دور تھا اور مذہبی فکر تشکیلِ نو کے مراحل سے گزرتے ہوئے اجتہاد کشادہ ذہنی کی نئی راہ ہموار کر رہی تھی اس لئے اس دور کے علماء کو آج کے مسلکی معیار پر جانچنا درست نہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل شہید کا آمین بالجہر یا رفع یدین کرنا غیر مقلد ہونے کے سبب نہیں بلکہ فقہ شافعی کی رعایت سے تھا اور اس کو بھی انہوں نے آخر میں تج دیا تھا۔

اس قسم کے علمی اور فقہی نوعیت کے اختلاف کو جن لوگوں نے عوامی انتشار پھیلانے کے لئے استعمال کیا وہ دراصل انگریزوں کے ہمنوا و معاون تھے اور چاہتے تھے کہ عوام میں جذبۂ جہاد پیدا کر کے انہیں انگریزوں کے خلاف میدانِ جنگ میں اتارنے والے علماء کو اتنا بدنام کر دیں کہ وہ ان کی آواز پر کان نہ دھریں۔ اسی لئے مولانا فضل حق خیر آبادی اور شاہ اسمٰعیل شہید کو ایک دوسرے کے مخالف کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔ حالانکہ یہ دونوں ایک ہی نسبی اور علمی سلسلے کی کڑی تھے۔[1] اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کوئی کدورت نہیں تھی۔ دونوں کے درمیان بعض علمی اور اعتقادی مسائل میں اختلافات ضرور پیدا ہوئے لیکن یہ ایسے اختلافات نہیں تھے جن کو ذاتی یا شخصی اختلاف کی صورت میں پیش کیا جاتا ایسے اختلافات تو غالب اور مولانا فضل حق میں بھی تھے۔ حالی کا بیان ہے کہ

"مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے۔

....

انہوں نے مرزا پر (کذا) نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو.......... مرزا نے ایک مثنوی، جو کہ ان کے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے۔ لکھ کر مولانا کو سنائی...... مرزا نے مسئلہ نظیرِ خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا، اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے۔ مرزا نے صاف صاف تو نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مگر اس مضمون کو اس پیرائے میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا، دوسرا خاتم پیدا نہیں ہو سکتا لیکن خدا قادر ہے کہ ایسا ہی ایک اور عالم پیدا کر دے اور اس میں خاتم النبیین کا مثل،

۱۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کا شجرۂ نسب ۳۳ واسطوں سے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جد جو ایران سے ہندوستان آئے وہ دو حقیقی بھائی تھے۔ ایک کا نام شیخ بہاء الدین تھا جو قبۃ الاسلام، بدایوں کے مفتی ہوئے اور دوسرے کا نام شیخ شمس الدین تھا جنہوں نے مسند افتاء رہتک سنبھالی۔ شیخ بہاء الدین کی اولاد مولانا فضل حق ہیں اور شیخ شمس الدین کی اولاد میں شاہ ولی اللہ دہلوی۔

جو اس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو، خلق فرما دے......"[۱]

علمی اور اعتقادی مسائل میں اختلافات کے باوجود جب مولانا فضل حق خیرآبادی اور غالب کی گہری دوستی تسلیم کی جاتی رہی ہے تو مولانا فضل حق اور شاہ اسماعیل شہید کے علمی فقہی اختلافات کو ان کے رشتۂ اخلاص کے رد میں کیونکر پیش کیا جا سکتا ہے؟ خاص طور سے اس صورت میں کہ غالب کا نقطۂ نظر بقول حالی، شاہ اسمٰعیل سے ملتا تھا یعنی وہ بھی تقلید جامد کو آزادیٔ فکر کے خلاف سمجھتے تھے اور توحید خالص کے حامی و موحد ہونے کے علمبردار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کو وہابیوں سے کوئی خصومت تھی نہ ان کے مخالفین سے کوئی انس۔ وہ مومن کی بہت عزت کرتے تھے اور ان سے مخاصمت رکھنے والوں میں ذوق کے ساتھ مولوی محمد باقر بھی تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور علامہ فضل حق میں بھی عقیدے کے اختلاف کے باوجود دشمنی نہیں تھی۔ شاہ اسمٰعیل نے شروع ہی سے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، مولانا فضل حق نے انگریزوں کی خدمت و ملازمت کے باوجود قید و بند کی مصیبت اٹھائی تو ان کے مخالف ہو گئے۔ لیکن غالب انگریزوں کی خوشامد کی اپنی پرانی وضع پر آخری سانس تک قائم رہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ فنکار کی فنی اور تخلیقی بصیرت، اجتماعی نصب العین، سماجی تاریخ کے احساس سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کو اپنے عہد میں سیاسی تہذیبی معاشرتی اور فکری سطح پر جس قسم کے حالات کا سامنا تھا ان میں اپنے داخلی نظم کو برقرار رکھنا بھی بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے پرانے استعاروں کی مدد سے تجربے اور احساس کی نئی صورتیں وضع کرنے میں اجتہاد کا مظاہرہ کیا جو ان جیسا نابغۂ روزگار ہی کر سکتا تھا۔ مگر یہ عذر اس لئے محل نظر ہے کہ اگر شاعر و ادیب کا دائرۂ فکر و عمل صرف داخلی نظم کی برقراری تک محدود کر دیا جائے گا تو انقلاب کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ تیرگیٔ شب کے خلاف کسی میں مزاحمت کا حوصلہ پیدا ہو گا نہ صبح کی سپیدی پھوٹے گی۔

مقام حیرت ہے کہ جو غالب اپنے شعروں میں از کار رفتہ اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے ماضی و حال کے زندہ اور صالح عناصر سے ایک نئے اور مبارک مستقبل کی تعمیر کا درس دیتے نظر آتے ہیں یا جن کے بارے میں صفائی دی جاتی ہے کہ وہ روایتی نظام میں تعفن پیدا کرنے والے ٹھہراؤ سے اوب کر انگریزوں کی ہنرمندیوں اور اجتہاد و ایجاد پر فریفتہ ہو گئے تھے، وہ اس حقیقت کا آخر دم تک

۲۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگارِ غالب ص ۹۰۔۹۱

احساس نہیں کر سکے کہ حب وطنی ایک فطری جذبہ ہے جو وقتی طور پر سرد تو پڑ سکتا ہے، ہمیشہ کے لئے مر نہیں سکتا۔ اس لئے جو ہندوستان ٹیپو شہید کے وقت سے ہی انگریزوں سے فیصلہ کن معرکے کی تیاریوں میں ہے، وہ برپا ہو کر رہے گا۔ بالآخر وہ معرکۂ عظیم برپا ہوا، مجاہدینِ حریت نے فتح پائی اور ۱۸۵۷ء کے صرف ۹۰ برس اور غالب کے انتقال کے ۷۸ برس بعد یہ ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔

☆☆☆

توقیتِ غالب

[۱۸۵۷ء سے وفات تک]

۲۸؍جنوری ۱۸۵۷ء	ذوق کے انتقال کے بعد مرزا فخرو (غلام فخرالدین) نے غالب کا تلمذ اختیار کیا۔ ۱۰؍جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔ غالب نے ان کی موت پر نبی بخش خاں حقیر کو جو خط لکھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو صرف اس بات کا غم تھا کہ مرزا فخرو سے ان کو ملنے والا چار سو روپیہ سالانہ اور بچوں کے لئے ۱۰؍روپیہ ماہانہ اب نہیں ملے گا۔ انہوں نے مولانا فضل حق خیر آبادی سے بھی اپنی پریشانیاں بیان کیں اور پھر انہی کے کہنے پر والیِ رام پور نواب محمد یوسف علی خاں کی خدمت میں قصیدہ بھیجا۔
۵؍فروری ۱۸۵۷ء	نواب یوسف علی خان ناظم، والیِ رام پور کے استاذ کی حیثیت سے غالب کا تقرر۔
مارچ، اپریل ۱۸۵۷ء	غالب نے ۸؍مارچ ۱۸۵۷ء اور یکم اپریل ۱۸۵۷ء کو نواب رام پور کو دو خطوط لکھے۔ دونوں خطوں کے لفافے دارالافتاء رام پور میں محفوظ ہیں لیکن خط چاک کر دیئے گئے ہیں۔ نواب رام پور کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کی خواہش پر یہ خط چاک کئے گئے تھے۔ (مکاتیب غالب، ص ۶، ص ۱۲۱)
۱۰؍مئی ۱۸۵۷ء	میرٹھ سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز
۱۱؍مئی ۱۸۵۷ء	دیسی فوج (تلنگوں) کا دہلی میں داخلہ، انگریزی تسلط کا خاتمہ، دیسی اقتدار کا قیام، غالب کی قلعہ کی تنخواہ اور انگریزی پنشن

بند۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہنگامہ کے دوران وہ روزنامچہ لکھنے میں مصروف تھے مگر یہ دعویٰ غلط ثابت ہو چکا ہے۔

۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء — انگریزوں کی فتح اور دہلی پر دوبارہ قبضہ

ستمبر ۱۸۵۷ء — انگریزوں کے دہلی پر دوبارہ قابض ہونے کے دوران امام بخش صہبائی ایک انگریز کی گولی کا نشانہ بنے۔

۱۸-۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء — میرزا یوسف علی (بیگ) خان (برادر غالبؔ) کی وفات۔ وہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے، غالبؔ نے انگریزوں کے عتاب سے بچنے کے لئے جھوٹ لکھا ہے کہ وفات بخار سے ہوئی۔

نومبر ۱۸۵۸ء — دستنبو کی اشاعتِ اوّل (مطبع مفیدِ خلائق، آگرہ)

۱۸۵۹ء — سکہ کا الزام۔ خط بنام حسین مرزا۔ نوشتہ ۱۸ جون ۱۸۵۹ء (گوری شنکر مخبر نے ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء ہی کو انگریزوں کو یہ جھوٹی خبر پہنچادی تھی کہ بہادر شاہ ظفر کے لئے سکہ غالب نے لکھا تھا۔)

۱۰ جولائی ۱۸۵۹ء — والیِ رام پور سے مستقل وظیفے کی درخواست اور اسی مہینے سے سو روپے ماہوار بطورِ وظیفہ مقرر

جنوری ۱۸۶۰ء — گورنر جنرل یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی آئے تھے۔ کچھ دنوں بعد ہی غالبؔ ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ جواب ملا کہ ''فرصت نہیں'' اور کہ تم ''باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔'' (یہ سلوک سکّے کے الزام کی وجہ سے تھا) درحقیقت یہ سکہ حافظ ویرانؔ شاگرد ذوقؔ کا کہا ہوا تھا جو ''صادق الاخبار'' کے ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء) کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ گوری شنکر مخبر کو ویرانؔ کی جگہ غالبؔ کا

نام یادرہ گیا تھا۔

۱۹/جنوری ۱۸۶۰ء	رام پور کا پہلا سفر (۲۷/جنوری کو رام پور پہنچے)
۲۴/مارچ ۱۸۶۰ء	رام پور سے واپسی (۱۷/مارچ کو رام پور سے روانہ ہوئے تھے۔)
مئی ۱۸۶۰ء	انگریزی پنشن کا دوبارہ اجراء۔ (تین برس کا بقایا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب سے ۲۲۵۰ روپے وصول ہوئے۔)
۲۹/جولائی ۱۸۶۱ء	دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن (مطبع احمدی، دہلی)
۱۹/اگست ۱۸۶۱ء	مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا جزیرۂ انڈمان میں انتقال
۱۸۶۱-۶۲ء	غالب کی چھٹی مُہر (غالب ۱۲۷۸ھ) یہاں سے غالب کی زندگی کا انتہائی شہرت کا زمانہ شروع ہوا۔
۱۸۶۲ء	قاطع برہان طبع اوّل (مطبع نولکشور، لکھنؤ)
۲/مارچ ۱۸۶۲ء	انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا دوبارہ اجراء
۲۳/اپریل ۱۸۶۲ء	لکھنؤ کے ''اودھ اخبار'' میں غالب کی ایک تحریر شائع ہوئی جو انگریز سرکار کی تحسین و تائید میں تھی۔ انہوں نے لکھا کہ ''ملک سراسر بے خس و خار ہوگیا ہے۔ قلمرو ہند نمونۂ گلزار ہوگیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا، اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق ہے، وہ ناقدردان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخوشنود ہے۔''
جون ۱۸۶۲ء	دیوان اردو کا چوتھا ایڈیشن (مطبع نظامی، کانپور)

یکم اکتوبر، ۱۸۶۲ء	لاڈو بیگم (بیوہ مرزا یوسف) کی گزارے کے لئے حکومت سے درخواست۔
۱۶/دسمبر ۱۸۶۲ء	مجروح کو لکھا کہ "۷/نومبر ۱۸۶۲ء...... جمعہ کے دن ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ وقید جسم سے آزاد ہو گئے۔"
مئی، جون ۱۸۶۳ء	دیوانِ فارسی (کلیاتِ نظم فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع نولکشور، لکھنؤ)
بعد از جون، ۱۸۶۳ء	دیوانِ اردو کی پانچویں اور آخری اشاعت (مطبع مفید خلائق، آگرہ)
جولائی ۱۸۶۳ء	یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے لاڈو بیگم (زوجہ مرزا یوسف مرحوم) کے نام سے ۲۰/روپیہ مہینہ خیراتی پنشن جاری ہوا۔
۱۸۶۴ء	مثنوی "ابرِ گہر بار" کی اشاعت (اکمل المطابع، دہلی)۔ (یہ مثنوی کلیاتِ نظم فارسی میں شامل تھی، لیکن اس سال الگ سے شائع ہوئی۔)
۱۸۶۴ء	"قاطع برہان" کے جواب میں "محرقِ قاطعِ برہان" مصنفہ سید سعادت علی کی اشاعت (مطبع احمدی، دلی)
۱۸۶۴ء	قادر نامہ کی دوسری اشاعت (محبس پریس، دلی)
۱۸۶۴ء	سر جان لارنس گورنر جنرل
۱۸۶۴ء	"لطائفِ غیبی" کی اشاعت۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ نام میاں دادخاں سیاح کا ہے تاہم اس کے مصنف غالب ہی ہیں۔
۱۸۶۴ء	"سوالاتِ عبدالکریم از عبدالکریم" کی اشاعت۔ اکمل المطابع، دلی۔ (دوسرے کے نام سے شائع ہوئی لیکن یہ

بھی غالب کی اپنی ہی تصنیف کہی جاتی ہے۔)

۱۸۶۵ء	''دافعِ ہذیان'' مصنفہ سید محمد نجف علی جھجری کی اشاعت۔
۱۸۶۵ء	''ساطع برہان'' از مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی کی اشاعت
۱۸۶۵ء	غالبؔ نے حکومت سے تین مطالبے کیے کہ انہیں شاعر دربار مقرر کیا جائے، پہلے سے اونچی جگہ ملے اور دستنبو کو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے کہ غدر میں غالبؔ کا روّیہ کیا تھا۔ رپورٹ ہوئی کہ ان سے سکّہ منسوب ہے۔ سب درخواستیں رد ہو گئیں۔ غالبؔ پر سکّہ کا الزام ان کی زندگی میں غلط ثابت نہ ہو سکا۔
۲۱/اپریل ۱۸۶۵ء	نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور کا انتقال، نواب کلب علی خاں کی جانشینی
اگست ۱۸۶۵ء	غالبؔ کے رسالے ''نامۂ غالبؔ'' کی اشاعت بجوابِ ساطعِ برہان (مطبع محمدی، دلّی)
۷/اکتوبر ۱۸۶۵ء	مرزا غالبؔ کا رام پور کا دوسرا سفر۔ ۱۲/اکتوبر کو رام پور پہنچے۔
۱۸۶۵ء	دستنبو کا دوسرا ایڈیشن (مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی)
دسمبر ۱۸۶۵ء	''قاطع برہان'' کی طبعِ ثانی بعنوان درفشِ کاویانی کی اشاعت۔ (اکمل المطابع، دہلی)
دسمبر ۱۸۶۵ء	رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی (۲۸/دسمبر کو رام پور سے روانہ ہوئے اور ۸/جنوری ۱۸۶۶ء کو دلّی پہنچے۔)
۱۸۶۶ء	''قاطع برہان'' کے جواب میں ''موید برہان'' مصنفہ مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع مظہر العجائب، کلکتہ)

۱۸۶۶ء

''قاطع برہان'' کے جواب میں ''قاطع القاطع'' مصنفہ امین الدین دہلوی کی اشاعت (مطبع مصطفائی، دہلی)[قاطع القاطع اگرچہ ۱۸۶۶ء میں چھپی مگر '' اپنی ابتدائی صورت میں '' قاطعِ قاطع برہان'' کے نام سے مرتب ہوکر محرقِ قاطعِ برہان (۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء) سے قبل دہلی کے ادبی حلقوں میں عام ہوچکی تھی۔''](مآثر غالب ۱۹۸۴ء ص ۹۸ / ۹۷)

۱۸۶۶ء

انتخابِ غالبؔ کی اشاعت۔ پہلے حصے میں دو دیباچے، ۱۲ر خط، ۲ر نقلیں اور ایک لطیفہ ہے ۔دوسرے حصے میں اردو کے ۱۳۱ر منتخب شعر ہیں۔مولوی ضیاء الدین خاں نے اس کے خطوط معمولی ردّوبدل کے بعد اپنی مرتبہ انشائے اردو (حصہ دوّم) میں شامل کر کے ۱۸۶۶ء میں مطبع فیضِ احمدی سے شائع کردیا تھا۔نہیں معلوم کہ یہ مکمل انتخاب غالبؔ کی زندگی میں کبھی شائع ہوا تھا کہ نہیں مگر بیسویں صدی میں یہ انتخاب پہلے تین بار ناقص چھپ چکا ہے۔کالی داس گپتا رضا نے اسے ۱۹۹۲ء میں اصل مخطوطے کے عکس اور مفصل تعارفی پیش لفظ کے ساتھ'' انتخابِ رقعات واشعارِ غالبؔ'' کے نام سے شائع کیا۔ بعد ازاں رشید حسن خاں نے اسے مزید معلومات کے ساتھ'' انشائے غالب'' کے نام سے شائع کیا۔

۱۸۶۶ء

رسالہ دہلی سوسائٹی میں غالب کا ایک مضمون شائع ہوا جو انہوں نے دہلی سوسائٹی کے دوسرے جلسے منعقدہ ۱۱ر اگست ۱۸۶۵ء میں پڑھا تھا۔اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ'' ۱۸۰۶ عیسوی سے جس کو آج ۶۰ر برس ہوئے سرکار انگریزی کا نمک خوار ہوں اور ۱۸۵۵ء یعنی ۱۰ر برس سے شہنشاہ بحر و بر حضرت فلک رفعت ملکۂ معظّمہ کا مدحت نگار ہوں۔''

۱۸۶۷ء(؟)	''دعاے صباح''فارسی منظوم ترجمہ(مطبع نولکشور، لکھنؤ) کالی داس گپتا رضا نے اس کا عکسی ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔
۱۸۶۷ء	''تیغ تیز'' کی اشاعت (اکمل المطابع، دہلی) (غالب نے یہ مختصر رسالہ موید برہان کے جواب میں لکھا تھا۔)
فروری ۱۸۶۷ء	''نکاتِ غالب'' و ''رقعاتِ غالب'' کی اشاعت مطبعِ سراجی، دہلی (پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائریکٹر میجر فلُر نے رائے بہادر ماسٹر پیارے لال کو حکم دیا کہ غالب سے فارسی قواعد سے متعلق کتاب لکھوائی جائے۔ ماسٹر صاحب موصوف کے کہنے پر مرزا نے یہ دو مختصر رسالے قلمبند کیے۔)
۱۱راپریل ۱۸۶۷ء	''ہنگامۂ دل آشوب''(۱) کی اشاعت۔ مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ (قاطع برہان کے مناقشے کے سلسلے کی منظومات)
اگست ۱۸۶۷ء	''سبد چین'' کی اشاعت (مطبع محمدی، دلّی)
۲۵رستمبر ۱۸۶۷ء	''ہنگامۂ دلآشوب''(۲) کی اشاعت۔ مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ
۲ردسمبر ۱۸۶۷ء	مولوی امین الدین دہلوی مصنفِ قاطع القاطع کے خلاف مقدمۂ ازالۂ حیثیت عرفی
جنوری ۱۸۶۸ء	کلیاتِ نثر فارسی (غالب) کی اشاعت (مطبع نولکشور، لکھنؤ) (اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں، پنج آہنگ، مہرِ نیم روز اور دستنبو شامل ہیں۔
۲۳رمارچ ۱۸۶۸ء	مولوی امین الدین دہلوی کے مقدمے سے دست برداری، راضی نامہ

۱۶ر جولائی ۱۸۶۸ء	مفتی محمد صدرالدین آزردہ کا دہلی میں انتقال
۲۷را کتوبر ۱۸۶۸ء	''عودِ ہندی'' مجموعۂ مکاتیبِ غالب کی پہلی اشاعت (مطبع مجتبائی، میرٹھ)
۱۵رفروری ۱۸۶۹ء	غالب کی وفات۔ (بستی نظام الدین، خاندانِ لوہارو کی ہڑواڑ (قبرستان) میں تدفین۔ اگرچہ بہت دنوں سے مختلف امراض کا شکار رہتے، لیکن موت سے چند دن پہلے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ۱۴رفروری دوپہر کو بے ہوش ہوگئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ اسی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے انتقال کیا۔ نواب رام پور کی جانب سے آخری وظیفہ بابت جنوری ۱۸۶۹ء غالب کی وفات سے صرف ایک گھنٹہ پہلے موصول ہوا تھا۔)

☆☆☆

۱۸۵۷ء کے بعد غالب کی مطبوعات

غالب کی زندگی میں شائع ہونے والی مطبوعات نظم ونثر کی کل تعداد ۳۳ر ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے صرف ۸ر مطبوعات، دیوانِ اردو ۱۸۴۱ء، دیوان فارسی غالب، پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء، دیوانِ اردو دوسرا ایڈیشن، ۱۸۴۷ء، پنج آہنگ پہلا ایڈیشن ۱۸۴۹ء، مثنوی بیان نموداری شان نبوت دولایت ۱۸۵۲ء، پنج آہنگ دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۳ء، مہر نیم روز پہلا ایڈیشن ۱۸۵۴ء اور قادر نامہ ۱۸۵۶ء شائع ہوئیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد شائع ہونے والی تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ان مطبوعات میں جداگانہ تصانیف بھی شامل ہیں اور ایک ہی تصنیف کے الگ الگ ایڈیشن بھی۔ غیر مطبوعہ تصانیف یا قلمی نسخوں کے بارے میں جو انکشافات ہوتے رہتے ہیں وہ اس تفصیل میں شامل نہیں ہیں۔

۹	دستنبو	پہلا ایڈیشن	نومبر، ۱۸۵۸ء
۱۰	دیوانِ اردو	تیسرا ایڈیشن	۲۹ر جولائی، ۱۸۶۱ء
۱۱	قادر نامہ	دوسرا ایڈیشن	۲۶ر نومبر، ۱۸۶۱ء
۱۲	قاطع برہان	طبع اوّل	۲۱ر مارچ، ۱۸۶۲ء
۱۳	دیوانِ اردو	چوتھا ایڈیشن	جون، ۱۸۶۲ء
۱۴	نگارستانِ سخن (کلام ذوقؔ و غالبؔ و مومنؔ)		۲۴ر اگست، ۱۸۶۲ء
۱۵	دیوانِ اردو	پانچواں ایڈیشن	بعد از جون، ۱۸۶۳ء
۱۶	کلیاتِ غالب	پہلا ایڈیشن	مئی/ جون، ۱۸۶۳ء
۱۷	قادر نامہ	تیسرا ایڈیشن	۹ر جولائی، ۱۸۶۳ء
۱۸	مثنوی ابرِ گہربار (الگ سے)	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۴ء
۱۹	لطائفِ غیبی	پہلا ایڈیشن	۲ر اکتوبر، ۱۸۶۴ء
۲۰	سوالاتِ عبدالکریم	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۴ء
۲۱	نامۂ غالب	پہلا ایڈیشن	قبل از ۱۳ر اگست، ۱۸۶۵ء
۲۲	نامۂ غالب	دوسرا ایڈیشن اودھ اخبار، ۱۰ر اکتوبر (۱۷ر اکتوبر)	۱۸۶۵ء
۲۳	دستنبو	دوسرا ایڈیشن	۱۸۶۵ء

۲۴	درفشِ کاویانی (قاطع برہان کا)	دوسرا ایڈیشن	نومبر/دسمبر ۱۸۶۵ء
۲۵	قطعۂ غالبؔ	پہلا ایڈیشن	قبل از ۳۱/جولائی، ۱۸۶۶ء
۲۶	انتخابِ غالب (جزوی طور پر ڈاکٹر ضیاء الدین خان کی مرتبہ "انشائے اردو" حصہ دوم، مطبوعہ فیض احمدی میں شامل)		غالب کی زندگی میں یہ کتاب مکمل کبھی نہیں شائع ہوئی۔
		پہلا ایڈیشن	۱۸۶۶ء
۲۷	دعاے صباح	پہلا ایڈیشن	قبل از ۲۰/نومبر، ۱۸۶۷ء
۲۸	تیغ تیز	پہلا ایڈیشن	۱۸۶۷ء
۲۹	نکاتِ غالبؔ (اردو) ورقعاتِ غالبؔ (فارسی)	پہلا ایڈیشن	فروری، ۱۸۶۷ء
۳۰	سبد چین	پہلا ایڈیشن	اگست، ۱۸۶۷ء
۳۱	کلیاتِ نثر غالبؔ	پہلا ایڈیشن	جنوری، ۱۸۶۸ء
۳۲	عودِ ہندی (نامۂ غالبؔ بھی شامل ہے)	پہلا ایڈیشن	۲۷/اکتوبر، ۱۸۶۸ء
۳۳	اردوے معلیٰ (غالب کی وفات کے ۱۹/دن بعد شائع ہوئی۔)	پہلا ایڈیشن	۶/مارچ، ۱۸۶۹ء

☆☆☆
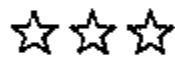
رسالہ ''الثورۃ الہندیہ'' اور ''قصائد ہمزیہ'' و ''دالیہ'' کا ترجمہ

مولانا فضل حق خیر آبادی (ف ۱۸۶۱ء) جب انڈمان پہنچے تو وہاں مفتی عنایت احمد کاکوروی (ف ۱۸۶۳ء)، مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے علماء پہلے ہی سے موجود تھے اوران بزرگوں کے وجود سے یہ بدنام وویران جزیرہ دارالعلوم بن گیا تھا۔ مفتی صاحب نے ''علم الصیغہ'' جیسی صرف کی مفید ترین کتاب یہیں لکھی تھی۔

مولانا فضل حق نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ انہیں میں سے رسالہ ''الشورۃ الہندیہ'' اور قصائد ''فتنۃ الہند'' بھی ہیں یہ رسالہ اور قصائد تاریخی اور ادبی دونوں حیثیت سے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی نہ مزاحمت کرنے والوں کو کوئی مدد پہنچائی کیونکہ انہوں نے اپنے قصیدہ میں واضح لفظوں میں اعترافِ قصور کرتے ہوئے اللہ سے معافی طلب کی ہے۔ انہی کے لفظوں میں:

> ''میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہوجانے پر خود بیٹھا رہا۔ میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا۔ یہ میں نے بڑا جرم کیا۔ جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کیلئے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا یا میں شہادت سے محروم رہا جبکہ سعادتمندوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔
>
> اے آمرزگار! میرے قصور کو معاف کر اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی اس سے درگزر کر، تجھی سے عفو ودرگزر کی امید ہے۔۔۔۔''

لیکن ان سطور سے ہی یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ گرفتاری کے بعد مولانا کے دل میں نہ صرف حصولِ آزادی کی چنگاری پیدا ہوئی بلکہ بھڑک کر شعلہ جوالہ بن گئی اور وہ اپنے قصور کے

اعتراف کے ساتھ ان لوگوں کی مذمت کرنے لگے جنہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس رسالہ اور قصائد سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں وہ ان لوگوں کے طرز عمل کے طرفدار ہو گئے تھے جن سے بعض علمی مذہبی امور میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ ''شہادت کے لئے بلانے والوں'' سے ان کی مراد وہی لوگ ہیں جو ۱۸۳۱ء میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی شہادت کے بعد دوبارہ مجتمع ہو کر انگریزوں سے جنگ کر رہے تھے۔

مولانا نے یہ رسالہ اور دونوں قصائد، مفتی عنایت احمد کاکوروی (ف ۱۸۶۳ء) کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں اپنے صاحبزادہ مولوی عبدالحق (ف ۱۸۹۹ء) کو بھیجے تھے کہ ابن میاں کو پہنچادیں۔ کوئلہ اور پنسل سے لکھے ہوئے مختلف پرچے کئی ماہ کی عرق ریزی کے بعد مرتب اور درست کیے جا سکے۔

اس رسالہ اور دونوں قصائد کی بنیادی حیثیت اگرچہ آپ بیتی کی ہے مگر اس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس سے پہلے کے واقعات کی مکمل تصویر کشی، بہادر شاہ ظفر کی کمزوری، مغل شاہزادوں کی بدعنوانی، بنیوں اور چند مسلمانوں کی غداری، مجاہدین کی جلاوطنی، حبس دوام، مردوں، عورتوں اور بچوں کے قتل عام کی دل دہلا دینے والی روداد بھی ہے۔ اس لئے یہ رسالہ اور دونوں قصائد ضمیمہ کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

ان میں مولانا کا ذاتی کرب بھی ہے اور ان کے عہد کا احساسِ الم بھی۔ غالبؔ اگرچہ ذاتی طور پر ان حالات سے دوچار نہیں ہوئے جن سے مولانا دوچار تھے، پھر بھی وہ اپنے عہد کے کرب سے مُبَرّا نہیں تھے۔ مگر انہوں نے اس کرب کے بیان کو خلافِ مصلحت سمجھا۔ ہاں کہیں کہیں غیر ارادی طور پر ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی جملہ ان کے باطنی کرب کا آئینہ ضرور بن گیا ہے۔ شعوری طور پر انہوں نے جو بھی تحریر لکھی ہے وہ سب انگریزوں کی مدح میں ہے۔

'الثورۃ الہندیہ' اور قصائد فتنۃ الہند کا عالمانہ ترجمہ مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی کے زور قلم کا نتیجہ ہے جو ترجمہ کرتے وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لٹن لائبریری سے اورینٹلسٹ کی حیثیت سے وابستہ تھے[1]۔ اس کی اشاعت سے پہلے ہی اس کو مولانا ابوالکلام آزاد کی

---

[1]۔ مگر ترجمے کے ساتھ ان کی بیان کی ہوئی بہت سی روایتیں محتاج تصدیق ہیں۔

خدمت میں نظر ثانی کی درخواست کے ساتھ ارسال کیا گیا تھا اور مولانا نے اس کا مطالعہ اور بعض جگہ تصحیح کرنے کے بعد یہ مسودہ ۱۷ رنومبر ۱۹۴۵ء کو ایک خط کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔

بندھیا چل (مرزا پور)

۱۷ رنومبر ۱۹۴۵ء

عزیزی، آپ کا خط اور رسالہ پہنچ گیا تھا۔ رسالہ کو میں نے سرسری نظر سے دیکھا۔ ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ رسالہ کو "غدریہ" سے تعبیر نہ کیجئے۔ اسے 'ثورۃ الهندیہ' کے نام سے مسمیٰ کرسکتے ہیں۔ رسالہ رجسٹرڈ واپس کررہا ہوں۔

اردو میں عربی عطف کا استعمال حالتِ ترکیب میں مستحسن نہیں۔ مثلاً "اب محبوس ظلم و تباہ شدہ ہے" اسے یوں لکھنا چاہئے "اب محبوس ظلم اور تباہ شدہ ہے"۔ ....

ابوالکلام

یہ خط اس حقیقت کا تو شاہد ہے ہی کہ مولانا آزاد نے رسالہ کے ترجمے کی اشاعت سے پہلے ہی اس کی صحت وسلاست کی سند دے دی تھی، اس بات کا بھی شاہد ہے کہ 'الثورۃ الهندیہ' مولانا کا دیا ہوا نام ہے۔

بعد میں جب اخبار 'مدینہ' بجنور کی طرف سے اس رسالہ اور قصائد کی اشاعت ہوئی تو اس میں ۲۱ راگست ۱۹۴۶ء کی لکھی ہوئی مولانا آزاد کی یہ تقریظ بھی شامل تھی۔

بسم الله الرحمان الرحیم

مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ اہلِ علم میں متداول تھا لیکن آج تک اس کی طباعت کا سروسامان نہ ہوسکا۔ "غدر" ۱۸۵۷ء کی بربادیوں کے بعد لوگوں کی ہمتیں اس درجہ پست ہوگئی تھیں کہ اس قسم کی تحریرات کی اشاعت کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ خود مولانا کے خاندان نے اس کی اشاعت مصلحت کے خلاف سمجھی اور جن لوگوں کے پاس اس کی نقلیں تھیں، وہ بھی

اس کی نمائش ، احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے۔

آج ہم اس رسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات ایسی نہیں پاتے جسے سیاسی حیثیت سے خطرناک تصور کیا جائے۔ لیکن اس زمانے کا حال دوسرا تھا۔"غدر" کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرم بغاوت مدۃ العمر قید کی سزا دی گئی تھی ، زیادہ سے زیادہ خطرناک بات یقین کی جاتی تھی۔

والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل ، مولانا مرحوم کی خدمت میں کی تھی اس لئے ان کی مصنفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔

مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کرکے والد مرحوم کو مکہ معظمہ بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولوی عبدالشاہد صاحب شروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تصحیح و اشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ اب ان کی کوشش سے نہ صرف اصل رسالہ پہلی مرتبہ شائع ہورہا ہے۔ بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی مہیا ہوگیا ہے۔

ترجمہ میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ سلیس اور شگفتہ عبارت میں کیا گیا ہے۔ اور اصل کی لفظی رعایت کے ساتھ اسلوب بیان کی شگفتگی اور روانی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ عزیز موصوف کی یہ سعی مشکور ہوگی اور رسالہ عام طور پر مقبول ہوگا۔

ابوالکلام

دہلی ، ۲۱/ اگست ۱۹۴۶ء

یہ رسالہ اور دونوں قصیدے انتہائی مایوس کن اور صبر آزما حالات میں لکھے گئے تھے۔ اس

کے باوجود ان میں فصاحت و بلاغت، ندرت بیان اور زبان وادب کی جو چاشنی ہے، وہ عربی زبان وادب پر مولانا کی قدرت کاملہ کا بین ثبوت ہونے کے ساتھ ان کے صاحب دل ہونے کی بھی دلیل ہے۔ محض زبان دانی کی بناء پر کسی تحریر میں وہ اثر نہیں آ سکتا جو اس رسالہ اور قصیدوں میں ہے۔ دستبرد زمانہ سے بچ رہنے والے مولانا کی نظم ونثر کے دوسرے فن پاروں کا بھی یہی حال ہے۔

مترجم نے ترجمہ کے ساتھ مولانا کی سوانح اور کارنامہ پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بار بار اس فتویٰ کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں مولانا عرشی اور مالک رام بڑی وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ مولانا فضل حق نے ایسا کوئی فتویٰ دیا ہی نہیں تھا۔ وائسرائے اور گورنر جنرل کے نام ان کی درخواست بھی منظر عام پر آ چکی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''...... اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر میں اسپیشل کمشنروں کے فیصلے کے خلاف قانون ہونے سے متعلق لکھا گیا ہے اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق انصاف کیا جائے یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور اس کے متعدد بے بس افراد خاندان پر رحم کو مدنظر رکھا جائے، بہر حال میری رہائی اور جائیداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائیں گے۔''[1]

اس لئے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا کوئی فتویٰ دیا تھا۔ مولانا کی سرگرمیاں اور حکومتی ذمہ داریاں بھی یہ تسلیم کرنے میں مانع ہیں کہ انہوں نے ایسا کوئی فتویٰ دیا ہوگا کیونکہ ۱۸۳۱ء میں معرکہ بالاکوٹ کے بعد بھی وہ نہ صرف حکومت کی ملازمت میں تھے بلکہ جھجھر، الور، ٹونک، سہارنپور اور رام پور میں حکومتی عہدے سنبھالتے ہوئے ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں حضور تحصیل کے مہتمم وصدر الصدور ہو گئے تھے۔ یہاں آنے کے بعد ہنومان گڑھی (اجودھیا) کا دردناک واقعہ پیش آیا جب ہنود نے مسجد کو نقصان پہنچانے کے ساتھ اس میں اذان دینے اور نماز پڑھنے پر پابندی عائد کر دی۔

جولائی ۱۸۵۵ء میں شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح کی قیادت میں مسلمانوں کی جمعیت نے بیراگیوں سے مقابلہ کیا اور مسجد ہی میں سب کے سب تقریباً ۲۶۹ مسلمان ذبح کر دیے گئے۔

۱۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد، تحریک، دہلی اگست ۱۹۵۷ء

اس کا سخت ردعمل ہوا۔ مولانا شاہ امیر علی نے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینا شروع کی اور جب مسلمانوں میں بہت زیادہ بے چینی پیدا ہوگئی تو لارڈ ہارڈنگ (گورنر جنرل ہند) کے حکم پر ایک کاؤنسل قائم کی گئی جس کے صدر مہتمم مولانا فضل حق تھے۔ مولانا نے شاہ امیر علی پر خود دباؤ ڈالنے کے علاوہ امراء اور علماء کو بھی استعمال کیا کہ وہ شاہ امیر علی کو مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب و تلقین کرنے سے باز رکھیں لیکن شاہ امیر علی اپنے مشن پر قائم رہے اور بالآخر اپنے پیش رو مجاہدین کی طرح شہید کر دیے گئے۔ حکیم نجم الغنی خاں نے لکھا ہے کہ "ہنومان گڑھی کے مشہور جہاد میں مولانا فضل حق خیرآبادی نے مولوی امیر علی اور جہاد کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔[1]

ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ مولانا فضل حق کی خدمات انگریزوں کے لئے تھیں اس لئے یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا کوئی فتویٰ دیا ہوگا یا کسی فتویٰ پر دستخط کئے ہوں گے۔ ان کو خود ہی اعتراف تھا کہ

> "مجھے ظلماً اہل وطن سے اچانک دور کر دیا گیا۔ مجھے کمزور و نحیف ذریت کو بھی چھوڑنا پڑا۔"

اس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ گرفتاری اور حبس دوام کے بعد مولانا کے دل میں نہ صرف ندامت بلکہ ان علماء، زہاد اور صاحبانِ سیف و تسبیح کے لئے رشک کے جذبات پیدا ہو گئے تھے جو انگریزوں کے خلاف دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔

مولانا کی زبان پر سچائی بہت دیر سے آئی مگر جب آئی تو جھوٹ، ظلم، مصلحت، اور خوشامد کی تاریک بدلیاں چھٹ گئیں اور حق گوئی کی صبح نو نمودار ہوئی۔

یہ سطور عہد غالب کے حقیقی حالات کا آئینہ ہیں۔ 'عہد غالب' کا مطالعہ چھان پھٹک کر انہیں سطور کی روشنی میں کیا جانا چاہئے۔

الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) اور قصائد فتنۃ الہند کا انگریزی ترجمہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کے جرنل ((جنوری ۱۹۵۷ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر قمر النساء کا علمی مقالہ بہ عنوان "علامہ فضل حق خیرآبادی مع تحقیق کتاب الثورۃ الہندیہ و حیاتہ و مآثرہ" ۱۹۸۶ء میں لاہور سے طبع ہو چکا ہے۔

☆☆☆

۱- تاریخ اودھ جلد ۵، حکیم نجم الغنی خاں، لکھنؤ ۱۹۱۹ء، ص ۲۲۲

الثورة الهنديه

تمام ثنائیں اس خدائے برتر کے لئے ہیں جس سے بغیر کسی ناامیدی کے، محنت و آزمائش، کہنگی و بوسیدگی اور غم و تکلیف سے نجات دینے کی بہت بڑی امید وابستہ ہے اور جو اسے اس کے اعلیٰ نام سے پکارے اسے بہترین عطایا اور بے شمار نعمتیں عطا فرمانے والا ہے، بالخصوص مظلوم و مضطر کی، اس کی مصیبتوں اور بیماریوں میں سننے والا ہے۔

سلام ہو اس خوشرو، خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے پر جس کی تمام نبی نوید مسرت آمد، سناتے آئے۔ بلاء و وباء کے دور کرنے، دشمنوں کے ظلم کے پردے چاک کرنے، بڑی بدبختی اور سخت بیماری سے نجات دلانے کی، گنہگاروں اور سیہ کاروں کو، اس کی شفاعت سے بڑی امید ہے۔ سلام ہو اس کی شریف و نجیب و کریم اولاد پر اور اس کے عظیم المرتبہ، شدید و رحیم اصحاب پر، خصوصاً پاکباز و صاف باطن پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں، ان سب پر قادر ہوں جب تک فرشتے آسمان پر تسبیح و تہلیل کرتے رہیں اور کشتیاں سمندر میں تیرتی رہیں۔

میری یہ کتاب، ایک دل شکستہ، نقصان رسیدہ، حسرت کشیدہ، اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے۔ جو اب تھوڑی سی تکلیف کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اپنے رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے، مصیبت سے نجات کا امیدوار ہے۔ جو ابتداء عمر سے عیش و فراغت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود محبوسِ دامِ ظلم اور تباہ شدہ ہے۔ اور مقبول دعاؤں کے ذریعہ خدا سے ازالۂ کرب کا طالب ہے۔ وہ بڑی مشکلات میں مبتلا، اور ترشرو ظالموں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ ان ظالموں نے اسے لباس سے معرا کر کے غم و حزن کی وادیوں سے ایسے تنگ و تاریک قیدخانوں میں ڈال دیا ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں۔

وہ محبوس و حزیں، سخت دل، اچکّے اور ظالم افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہے، وہ ایک سیدھا سادھا، نرم خو، اور مریض و کمزور ہوتے ہوئے شریر و بدفطرت کی قید میں ہے۔ اور ظالم و جابر، بدخلق و بدکردار کے مظالم سے حیران و پریشان ہے۔ وہ آفت رسیدہ، ایسے مصائب میں مبتلا ہے جن کی سختیوں تک قیاس کرنے والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا اور ایسا مضطر و محتاج ہے جو سخت عذاب و احتباس میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ سفید رو، سیاہ دل، متلون مزاج، ترشرو، کنجی آنکھ، گندم گوں بال والوںکی قید میں آ چکا ہے جس کا اپنا عمدہ لباس اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا گیا ہے۔ جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور اپنے رب سے لو

لگائے ہوئے ہے۔ اپنے تمام اعزہ واقرباء سے دور اور بہت دور ہے۔ مدعی اور منازع کے بغیر اس پر فیصلہ صادر کردیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہم نشینوں اور خادموں کے سامنے شرمندہ ہے۔ اس کے بازوؤں کو سخت تصادم سے کمزور کردیا گیا ہے۔ وہ غمزدہ، تنہا اور دور افتادہ ہے۔ اسے اپنی زمین و شہر سے جلا وطن اور اہل وعیال سے دور کردیا گیا ہے۔ یہ سارا ظلم وستم، ظالم بدکیش نے روا رکھا ہے اور اس کے اہل وعیال کو اپنی درندگی کی جھاڑی میں چھوڑ دیا ہے۔ اسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی ہے۔ اس کا قصور، صرف ایمان اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا اور علماء اعلام میں شمار ہونا ہے۔

اس سے ان ظالموں کا مقصد نشان درس وتدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا ہے، وہ صفحاتِ قرطاس سے بھی نام ونشان مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس حادثہ فاجعہ (انقلاب ۱۸۵۷ء) کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس نے آبادیوں کو ویران اور مصیبتوں کی پُر شور زمین کو شاداب بنا دیا ہے۔ جس سے غموں کے بادلوں سے کڑکتی ہوئی بجلیاں مصیبت زدگانِ وطن پر گریں اور ان پر بادشاہوں کو غلام وقیدی اور امراء کو محتاج وفقیر بنانے والی محتاجی وناداری مسلط کردی گئی۔

یہ داستانِ الم اس طرح ہے کہ وہ برطانوی نصاریٰ جن کے دل ممالک ہند کے دیہات و بلاد پر قبضہ، اور اس کے اطراف واکناف وسرحدات پر تسلط کے بعد عداوت وکینہ سے بھر گئے تھے، اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل وخوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ سرِ نافرمانی کو جنبش دے سکے۔ انہوں نے تمام باشندگانِ ہند کو کیا امیر کیا غریب چھوٹے بڑے مقیم ومسافر، شہری ودیہاتی سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار ومعاون نصیب ہوسکے گا۔ اور نہ انقیاد واطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہوسکے گی۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انہی کی طرح ملحد وبے دین ہو کر ایک ہی ملت پر جمع ہوجائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف، تسلط وقبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کردے گا۔ اس لئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر وحیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان ودین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے۔ پچھلے زمانے کے علوم ومعارف، اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلّہ کی پیداوار، کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کئے جائیں، اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں پر آ پڑے۔

اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان کے اعوان و انصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف و پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکامِ دینِ مبین کو مٹانا وغیرہ

اپنے مکر کی ابتداء اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو، مسلم لشکریوں کو ان کے رسوم و اصول سے ہٹانے اور مذہب و عقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے۔ ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکام نصرانیت بجالانے پر آمادہ ہو جائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا و عقاب کے ڈر سے خود ہی مجال انکار نہ ہو سکے گی۔

انہوں نے ہندو لشکریوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے، گائے کی چربی، اور مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سور کی چربی چکھانے پر زور ڈالا۔ یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے مذہب و اعتقاد کی حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت و انقیاد سے منہ موڑ لیا۔ ان کے اس اضطراب نے خرمنِ امن پر چنگاری کا کام کیا۔ گروہِ نصاریٰ کا قتل، ڈاکہ زنی، ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کر دیا۔ بعض لشکری حد سے تجاوز کر گئے۔ انہوں نے قساوتِ قلبی اور شوریدہ سری کا انتہائی مظاہرہ کیا، بچوں اور عورتوں کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بے گناہ عورتوں کی قتل و غارت گری سے رسوائی و ذلت کے مستحق بن بیٹھے۔[1]

---

[1] غالب انگریزوں کے ہمنوا تھے۔ انہوں نے انگریز عورتوں، بچوں کی بے حرمتی اور قتل کی شدید مذمت کی ہے لیکن ہندوستانیوں پر انگریزوں کے وحشیانہ مظالم کو یہ کہہ کر جائز ٹھہرانے کی کوشش کی ہے کہ فاتح ایسا ہی کرتے ہیں۔
مولانا فضل حق بھی بعض لشکریوں کے طرز عمل کے شاکی ہیں شاید اس لئے کہ انگریزوں نے لشکریوں اور مجاہدوں کی سرکوبی کرتے ہوئے...... (بقیہ صفحہ دیگر)

پھر تمام ''باغی'' گردہ لشکریاں، اپنی چھاونیوں سے، اپنے افسروں سے نبٹنے کے بعد چل کھڑے ہوئے۔ عاملوں اور حاکموں کے نظام درہم برہم ہوگئے۔ راستوں کے امن میں خلل و فتور، مخلوق خدا میں فتنہ وفساد اور دیہات و بلاد میں شور وشغب پھیل گیا۔ طوفان حوادث جوش میں آ گیا۔

بہت سے لشکر، شہر مشہور، بلد معمور، مسکین آلِ تیمور، دار السلطنت دہلی جا پہونچے۔ وہاں پہنچ کر ان سب نے ایسے شخص کو سردار و پیشوا بنا لیا جو اس سے پہلے بھی ان کا آمر و حاکم تھا جس کے پاس اس کے ارکانِ دولت اور وزیر بھی تھے لیکن وہ خود ضعیف، غمزدہ اور ناتجربہ کار تھا۔ عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا، اور سچ پوچھئے تو آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریک حیات[1] اور وزیر[2] کا مامور و محکوم تھا۔ اس کا یہ وزیر جو حقیقت میں نصاریٰ کا کارپرداز اور ان کی محبت میں غالی تھا، صحیح معنوں میں حاکم و والی اور نصاریٰ کے دشمنوں کا شدید ترین مخالف تھا۔ یہی اس آمر و حاکم کے اہلِ خاندان کا حال تھا۔ ان میں سے بعض مقرب بارگاہ[3] اور راز دار بھی تھے۔ یہ سب کے سب جو جی چاہتا تھا کرتے تھے۔ اپنی آراء پر عمل پیرا ہوتے تھے لیکن اس کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور وہ سردار ایسا ضعیف الرائے، ناتجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا، اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ کوئی کام اپنی رائے سے نہ کر سکتا تھا، نہ اچھا نہ برا، سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا نہ کسی کو خفیہ یا علی الاعلان کوئی حکم دے سکتا تھا نہ کسی کو نفع وضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا۔

یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہات سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت[4]، علماء زہاد اور ائمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر، جدال و قتال کے لئے اٹھ کھڑی

......(صفحہ دیگر سے جاری)......ان کی کردار کشی بھی کی تھی اور کردار کشی کی اس مہم نے اس وقت کے عوام کے ذہنوں کے ساتھ ہماری تاریخ کو بھی مسموم کر دیا تھا۔

حیرت ہوتی ہے کہ انگریزوں نے مجاہدوں اور لشکریوں کے جن مظالم کو بہت زیادہ شہرت دی ہے ان کی خود برطانوی ماخذ سے بھی نفی ہوتی ہے۔

ان کے محکمۂ جاسوسی کے سربراہ اعلیٰ سر ولیم میور کی تحریری رپورٹ ہے کہ:

''خواہ کتنی ہی ستم رانی اور خوں ریزی ہوئی ہو، جہاں تک میرے مشاہدات اور تحقیقات کا تعلق ہے۔ عورتوں کی بے حرمتی کی کہانیوں کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں'' ۔ Savarkar, V.D. India's War of Independence.

۱۔ ملکہ زینت محل، ۲۔ حکیم احسن اللہ خاں، ۳۔ شہزادہ مرزا مغل، ۴۔ مولوی ابو سعید مستفتی وغیرہم۔

ہوئی۔

ادھر اس ناتجربہ کار سردار نے اپنے بعض ناعاقبت اندیش، سفیہ، خائن، اور بزدل اولاد کو امیر لشکر[1] بنادیا، یہ لوگ دیانتدار عقلمندوں سے متنفر تھے۔

انہیں نہ تو میدانِ کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا ہی موقعہ ہوا تھا۔ انہوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہمنشین و جلیس بنالیا۔ اس طرح یہ ناآزمودہ کار، آرام طلبی، اسراف بیجا اور فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے۔

وہ تنگدست ہو چکے تھے پھر مالدار ہو گئے۔ جب مالدار ہو گئے تو عیش پرستیوں میں پڑ گئے لوگوں سے، لشکروں کے ساز و سامان کے بہانے سے کافی مقدار میں مال جمع کرتے تھے اور اس میں سے ایک حبہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے تھے جو کچھ وصول کرتے تھے خود کھا جاتے تھے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن ان کو توزنانِ فاحشہ و تباہ کار نے طلایہ کی قیادت اور کنیزوں کی شب باشی نے لشکروں کے ساتھ رات کو چلنے سے روک دیا اور آلات عیش و طرب نے آرام طلبی میں ڈال کر مقدمۃ الجیش سے بھی پیچھے کر دیا۔ ان کے دلوں میں نامردی اور ذلیل اندیشہ بیٹھ گیا۔ اسی نے ان کو وسطِ لشکر میں ثابت قدمی سے روکا۔ شومئ قسمت نے میمنہ سے اور قمار و تونگری نے میسرہ سے باز رکھا، ان کے خوشامدی اور بازاری ہم صحبتوں نے ساقہ (پچھلا دستہ) سے بھی علیحدہ رکھا۔ ایسا ہی ہوا کرتا ہے جب کسی نااہل کو کوئی بڑا کام سپرد کیا جاتا ہے اور کمزور پر بھاری بوجھ لادا جاتا ہے۔ وہ رات سو کر اور دن بدمست ہو کر گذارتے جب بیدار و ہشیار ہوتے تو غافل و حیران پھرتے۔

نوبت بایںجا رسید کہ نصاریٰ کا لشکر ان پر آ کر ٹوٹ پڑا۔

ایک بلند پہاڑی پر چڑھ کر شہر کا رخ کر دیا۔ شہر کا محاصرہ کر کے خندقیں کھود ڈالیں، پہاڑی پر توپیں اور منجنیقیں نصب کر کے شہر پناہ اور مکانات پر گولہ باری شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بجلیاں اور تارے ٹوٹ ٹوٹ کر عمارتوں پر گر رہے ہیں۔

ہندوستانیوں کا برسرِ پیکار اور "باغی" لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا۔ بعض گروہ کا کوئی جنرل ہی نہ تھا۔ بعض کو جائے پناہ بھی میسر نہ تھی، بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھادیا تھا، کچھ، تھوڑا سا مالِ غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ کچھ ترساں و لرزاں قلب کے ساتھ بھاگ چھوٹے تھے۔ بعض طغیان و سرکشی سے بدکار عورتوں پر قبضہ جما بیٹھے،

1۔ مرزا مغل و خضر سلطان

بعض نے میدانِ جہاد کے تنگ و سخت فوجی کپڑے پہن کر صفوف جنگ میں داخل ہونے کو برا جانا۔
صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے اور پست ہو گئے تو غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز و سامان حرب سے تھوڑی سی مدت میں پے در پے مدد کی، تب تو نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان دی اور اس پہاڑی پر بہت سا لشکر اور مددگار و معاون جمع کر لئے۔ ان کے لشکریوں میں گورے منہ کے گروہ بھی تھے، اور ذلیل ترین ہندو اجیر بھی، اور وہ بد بخت و بدکیش مسلمان بھی جو ایمان کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد ہو کر اپنے دین کو چند ٹکوں کے بالعوض بیچ چکے تھے۔

ہزاروں شہری بھی نصاریٰ کی محبت کا دم بھرنے لگے اور تمام ہندو ان کے ساتھ ہو گئے۔
مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ تو ان (غیر ملکیوں) کا جانی دشمن تھا۔[1] دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس نے ہندوستانی لشکر کی بربادی، مجاہدین کی شوکت و وقار کی خواری، اور ان کے قلع قمع کرنے میں، مکر و حیلہ سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، ان کے اندر افتراق و انشقاق پھیلانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

پھر تو نصاریٰ، شہر اور اس کے پھاٹکوں، دربانوں اور محافظوں پر حملہ کرنے لگے۔ ادھر جماعت مجاہدین اور لشکریوں کے ایک بہادر گروہ نے ان کے حملوں کو روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل ہونا اپنے لئے اہم ترین فرض قرار دیا۔

دن رات پیدل اور سوار دادِ شجاعت دینے لگے۔

چار مہینے (مئی ۱۸۵۷ء سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک) تک متواتر جنگ ہوتی رہی۔ دشمن اس مدت میں کثیر لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہو سکا۔

جب بھی حملہ کرتے تھے روکے جاتے تھے، جس وقت اقدام کرتے تھے لوٹائے جاتے تھے۔ بہادر اور نگہبان غازی بڑے زور و شور سے یلغار کو روک رہے تھے۔ مدافعت و مبارزت میں خوب خوب جوہر دکھا رہے تھے۔

مقابلے میں ثابت قدم تھے اور پیش قدمی کرنے والے پر آگے بڑھ کر حملہ آور تھے۔ ان میں سے بہت سے جام شہادت پی کر سعادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔

۱۔ یہ گروہ ان مجاہدین کا تھا جنہیں انگریزوں نے ''وہابی'' کہا ہے حالانکہ یہ وہابی نہیں تحریک ولی اللّٰہی کے پروردہ اور علمبردار تھے۔

نیکوکاروں کے لئے بہشت، حوریں اور اس سے بڑھ چڑھ کر بھی نعمتیں ہیں۔ اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کر کے رات گذارتی اور صبح ہوتے ہی دشمن کے مقابلہ پرڈٹ کر نبرد آزما لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر شہر پناہ کی حفاظت اور شہری سرحدات کی نگہداشت کرتی۔ بدقسمتی سے ایک شب کو پہاڑی کی محاذی کمین گاہ پر ایک عیش پرست، بزدل اور کسلمند جماعت مقرر کردی گئی۔ وہ اپنے ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سوگئی، دشمن نے موقعہ غنیمت سمجھ کر شب خون مارا اور ہتھیاروں پر قبضہ کر کے اسے قیامت تک کے لئے سلادیا۔

جب نصاریٰ نے اس کمین گاہ پر قبضہ کرلیا تو بہت سی توپیں اور منجنیقیں نزدیک ترین شہر پناہ اور قریب ترین برج پر ان کے گرانے اور محاذی پھاٹک کھولنے کے لئے لگادیں۔ اور دن رات گوپھنوں اور بندوقوں سے گولیوں کا مینھ برسانا شروع کردیا۔ جس سے شہر پناہ کی دیوار اور برجوں میں شگاف پڑ گئے۔ پھاٹک گر پڑا اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ حائل پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ کوئی لشکری، اٹھنے بیٹھنے کی وہاں قدرت نہ رکھتا تھا۔ نہ دیوار پر چڑھ کر جھانک سکتا تھا۔ جو جھانکتا تھا گولی کا نشانہ بن کر خندق میں جا پڑتا تھا۔

اب نصاریٰ نے یہ چال چلی کہ ایک لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا تاکہ دوسری طرف سے حملہ محسوس کیا جائے۔ یہ دیکھ کر مجاہدین اور لشکریوں کا گروہ ادھر متوجہ ہوگیا اور دشمن کا مکر نہ سمجھتے ہوئے وہاں مدافعت میں مشغول ہوگیا۔ یہ موقعہ پاکر نصاریٰ اور ان کا لشکر اسی گرے ہوئے پھاٹک، ٹوٹی ہوئی دیوار، اور منہدم برج سے داخل شہر ہوگئے۔ وہاں انہیں کوئی مزاحم و مدافع نہیں ملا۔

پس وہ تلاش کر کے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچ گئے جو پہلے ہی سے ان کے معاون و مددگار بن چکے تھے۔ انہوں نے فوراً ان کی حفاظت کا گھروں میں انتظام کیا اور جلد جلد، پہلے سے تیار شدہ ضیافت سے نوازا،

انہیں خوب پیٹ بھر کر گوشت اور دودھ کھلا یا پلایا اور تمام ضرورت کی چیزیں مہیا کیں۔

مکانوں کے دروازے بند کر کے دیواروں میں روزن کردیئے تاکہ جو ''باغی'' ادھر آنکلے اس پر گولی چلا کر اپنی حفاظت کرسکیں۔ چنانچہ جو لشکری یا شہری ادھر آنکلتا، یہ بندوق چلا کر مار ڈالتے اور مقابل کا ان پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔

وہ فرصت کے منتظر رہتے تھے کہ موقعہ پاکر اپنے دوستوں کے گھروں کی طرح دوسرے

گھروں میں بھی پہنچ کر انہیں شب و روز کی آرام گاہ بنائیں۔ لیکن وہ لعنتی جب بھی نکلتے پکڑ کر قتل کر دیئے جاتے، اس لئے جہاں انہیں مقابلہ کا اندیشہ ہوتا وہاں بہت کم نکلتے کیونکہ اس کے باوجود انہیں پہاڑی سے مسلسل مدد پہنچ رہی تھی اور ہر عیسائی دوست ہندو، ان کی مدد میں پیش پیش تھا۔

بڑی مصیبت یہ آ پڑی تھی کہ شہر میں نہ کوئی جائے پناہ رہی تھی اور نہ حاکم ہی رہا تھا۔ کیونکہ حاکم (بادشاہ) اپنے اہل وعیال کو لے کر شہر سے تین میل دور مقبرہ[1] میں جا چکا تھا۔ وہ دراصل اپنی بیگم اور خائن وزیر کا مطیع تھا جس نے کذب و بہتان سے کام لے کر دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر بادشاہ کو پھسلایا تھا کہ نصاریٰ قابض ہونے کے بعد اس کے ساتھ اچھا سلوک کرینگے، اور اسی کو بزرگی و سرداری بخش دیں گے۔ وہ فریب خوردہ، ان شیطانی وعدوں اور ابلیسی آرزوؤں پر خوش تھا۔ بادشاہ کے ساتھ اسکے تمام امراء و متعلقین بھی اپنے اہل وعیال کو لے کر، گھروں میں مال ومتاع چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان سب کے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے شہریوں پر سراسیمگی و رعب طاری ہو جانا قدرتی امر تھا۔ مرعوب ومتاثر لوگ بھی مکان چھوڑ بھاگے۔

جب شہر کے مکان مکینوں سے خالی ہو گئے تو نصاریٰ اور ان کا لشکر ان میں داخل ہو گیا، انہوں نے مال ومتاع لوٹا، باقی ماندہ ضعیفوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ بہادرانِ شہر میں سے ایک بھی ایسا نہ بچا تھا جو ان کا کسی اعتبار سے مقابلہ کر سکتا۔

''باغی'' لشکروں میں سے بعض تو نصاریٰ کے قبضہ سے پہلے ہی بھاگ گئے۔ بعض قبضہ کے بعد ثابت قدم نہ رہ سکے۔ بعض کئی بار شہر میں مصروف کارزار رہ کر بے دم ہو چکے تھے۔ اب بنیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے اور بادشاہ کے ان کار پردازوں[2] نے جو مجاہد گروہ کے دشمن تھے ایسی تدبیر سوچی جس سے شہریوں اور لشکریوں کو ہلاک کر سکیں۔ انہوں نے وہ سب غلہ جو بنیوں کے پاس تھا چھپا دیا اور دیہات وقصبات سے جو ان کے پاس اناج آتا رہتا تھا وہ روک دیا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی، لشکری اور شہری، بھوک، پیاس، سوزش اور بے چینی سے، دن رات گذارنے لگے۔ بالآخر مجبور و پریشان ہو کر بھاگ گئے، پھر تو نصاریٰ نے شہر کے پھاٹک، شہر پناہ، قلعہ بازار، اور مکانوں پر مکمل قبضہ جمالیا۔

اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل وعیال[3] موجود تھے، اور مجھے بلایا بھی گیا۔ ساتھ ہی فلاح و کامیابی، کشائش وشادمانی کی امید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا

۱۔ مقبرہ ہمایوں ۲۔ مرزا الٰہی بخش
۳۔ مولوی شمس الحق اور ان کی والدہ وغیرہ

تھا۔ میں نے دہلی کا رخ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر اہل وعیال سے ملا۔ اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن نہ انھوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔

جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکری و شہری باقی نہ رہا۔ غلہ اور پانی، دشمنوں کے ظلم واستبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا تو پانچ شبانہ روز اسی حالت میں گذار کر، اپنی عزیز ترین متاع کتابیں، مال واسباب، چھوڑ کر (بار برداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے، اہل وعیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔[1]

۱۔ کالی داس گپتا رضا نے ''غالبیات: چند عنوانات'' میں اس سفر کی تفصیل بیان کی ہے۔ ساتھ ہی اس کے پس منظر اور سنین کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔

''جب ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں ''جنگ آزادی'' کا آغاز ہوا تو مولانا فضل حق خیر آبادی الور میں تھے۔ ۱۵ رجولائی ۱۸۵۷ء کو الور میں مہاراجہ بے سنگھ کا انتقال ہو گیا اور بقول مولانا وہ مہاراجہ کی وفات کے ایک ماہ بعد یعنی ۱۵ راگست ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ جیون لعل اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ مولانا ۱۶ راگست (عبداللطیف کے مطابق ۱۹ راگست) کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل تھے اور انھوں نے نذر پیش کی۔ اسی زمانے میں سرجان لارنس پنجاب سے کمک لے کر دلی پہنچے۔ ۱۴ ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب انگریزی فوج فاتح ہو کر دلی شہر میں داخل ہوئی تو مولانا شہر ہی میں موجود تھے۔ پانچ دن تک شہر کے گلی کوچوں میں دست بہ دست مڈبھیڑ ہوتی رہی اور آخر کار ۱۹ ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر مکمل طور پر انگریزی فوج کے قبضے میں آ گیا۔ بقول مولانا پانچ دن بعد وہ ۱۹ ر ستمبر یا ۲۴ ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو خدا پر بھروسہ کر کے بیوی بچوں کو ساتھ لے (الور کو) چل کھڑے ہوئے۔'' سارا ساز و سامان اور کتابیں اور مال وغیرہ وہیں (دلی میں) چھوڑا۔'' اہل وعیال کو الور میں چھوڑ کر مولانا نے دسمبر ۱۸۵۷ء میں خیر آباد کی راہ لی۔ خیر آباد کے علاوہ چندے کھیڑی، ہرگاؤں، تنبول، سہور پور، دریہ وغیرہ میں رہے اور ۲۶ ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو انھوں نے سیہا کے مقام پر کرنل کلارک سے ملاقات کی جس نے حکم دیا کہ مولانا کو ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مولانا ۳۰ ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے حاضر ہوئے اور اپنے مکان ہی پر ٹھہرے رہے۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے انہیں لکھنؤ روانہ کر دیا۔ مقدمہ ۲۲ ر فروری ۱۸۵۹ء کو مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ مئی ۱۸۵۹ء میں انہیں لکھنؤ سے مختلف جیلوں میں رکھتے ہوئے کلکتہ پہنچایا گیا اور وہاں سے فائر کوئین Fire Queen نامی جہاز میں انڈیمان بھیج دیا گیا۔ جہاز ۸ ا کتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیئر پہنچا ایک سال دس مہینے تیرہ دن بعد ۲۰ راگست ۱۸۶۱ء کو مولانا نے وہیں انتقال کیا۔''

گپتا رضا کی رائے میں یہ قصیدہ ستمبر ۱۸۵۷ء کے تیسرے یا چوتھے ہفتہ اور دسمبر ۱۸۵۷ء کی درمیانی مدت میں کہا گیا ہوگا۔

شہر اور اس کے مال و دولت پر سفید رو لشکریوں کے ذریعہ قابض ہو کر، نصاریٰ کی تمام تر توجہ، بادشاہ اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے پکڑنے کی طرف مبذول ہوئی۔

ان سب نے اب تک اپنا مستقر (مقبرہ) نہ چھوڑا تھا، تقدیر الٰہی نے وہیں برقرار رکھا تھا۔ انہیں اپنے جھوٹے اور مکار وزیر کی کذب بیانی پر اعتماد تھا۔ وہ اس مقبرہ میں بڑے خوش اور مگن تھے۔ مخدوم بنے ہوئے ہی دن گذار رہے تھے۔

اس فریب خوردگی کا نتیجہ ہوا کہ حسرت کشیدہ، دل تپیدہ، بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ پابہ زنجیر شہر کی طرف لیجایا گیا۔ راستے میں بیٹوں اور پوتوں کو کسی سردار[1] نے بندوق کا نشانہ بنایا، دھڑ وہیں پھینک کر، سروں کو خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے تحفۂ پیش کیا۔ پھر ان سروں کو بھی کچل کر پھینک دیا۔

بادشاہ کو گورے منہ، سیاہ دل، گندمی بال اور کنجی آنکھ والوں کی حراست میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ کوٹھری میں مقید کر دیا۔ پھر اس وسیع ملک سے نکال کر دور دراز جزیرہ[2] میں پہنچا دیا۔

بادشاہ کے ساتھ اس بیگم کو بھی روانہ کیا گیا جو نصاریٰ کی اس وقت بھی مطیع و دوست تھی جبکہ وہ حقیقت میں ملکہ تھی۔ وہ اپنی آرزوؤں (بیٹے کو جانشین بنانے) میں ناکام رہی، اس کا جمع کردہ مال بھی چھین لیا گیا۔ وہ زینت (زینت محل اس ملکہ کا نام تھا) بننے کے بعد بدصورت اور حفاظت کے بعد بدہیئت بنی۔ بادشاہ کی قوم میں سے جو بھی ملتا اس کی گردن ماردی جاتی یا پھانسی دی جاتی جیسا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی عمل کیا گیا۔ ان کمزوروں میں سے وہی بچ سکا جو رات میں چھپ کر یا دن میں نظریں بچا کر تیزی سے بھاگ گیا اور ایسے خوش نصیب بہت کم تھے۔

پھر نصاریٰ نے شہر کے گرد و نواح کے رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا، ان کی جائیداد، عمارتیں، مویشی، مال و متاع، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور ہتھیاروں وغیرہ کو لوٹنا شروع کیا۔

اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اہل و عیال کو بھی قتل کر ڈالا حالانکہ یہ سب رعایا بن چکے تھے اور ڈر یا لالچ سے فرمانبردار بن ہی جاتے۔ انہوں نے تمام راستوں پر چوکیاں بٹھادیں تاکہ بھاگنے والوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جائے، ہزاروں بھاگنے والوں میں تھوڑے ہی بچ پائے۔ باقی سب پکڑے گئے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے، پھر چادر، تہبند،

۱۔ مرزا مغل، خضر سلطان وغیرہما کو ہڈسن نے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔
۲۔ رنگون

قمیص، پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے ۔ اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچادیتے، وہ ان کے لئے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے، جوان، بوڑھا، شریف اور رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ اس طرح پھانسی پانے والوں اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزار ہا تک پہنچ گئی، ظالموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔

ہندوؤں میں صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا یقین تھا، اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے، یا وہ نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب میں قاصر تھے یا وہ جوان کے جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے۔ انہیں میں سے بادشاہ کا وہ عامل[1] تھا جس نے نصاریٰ کو مسلط کر کے حاکم بنایا تھا۔ لیکن اسے امیدوں کی محرومی اور ناکامی کی حسرت کا غم اٹھانا پڑا۔ اس کا حال متغیر ہوگیا۔ زمانے میں ذلیل و خوار ہوکر جیا، دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان میں رہا۔ اور یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔

ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندوؤں کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمہارے علاقہ میں سے گذرے اسے پکڑ لیا جائے۔ ان بداطواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔ ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا۔ نہ کوئی عالی خاندان فرد بچ سکا نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔

پھر اطراف و اکناف ملک میں لشکر بھیجے جنہوں نے قتل و غارتگری کی انتہا کردی۔

اس ابتلاء عظیم میں، پردہ نشین خواتین پیدل نکل کھڑی ہوئیں، ان میں بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں جو تھک کر عاجز ہوگئیں، بہت سی خوف کی وجہ سے جان دے بیٹھیں، اور پچاسوں عفت و عصمت کی بناء پر ڈوب کر مرگئیں۔ اکثر پکڑ کر قیدی بنائی گئیں اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوگئیں۔ کچھ کو بعض رذیلوں نے لونڈیاں بنایا اور بعض چند ٹکوں کے بالعوض بیچ ڈالی گئیں۔ بہت سی بھوک، پیاس کی تاب نہ لاکر مرگئیں۔ بہت سی ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نہ تو لوٹ کر ہی آئیں نہ ان کا کچھ پتہ ہی چل سکا۔

ہزاروں عورتیں، اپنے سرپرستوں، شوہروں، باپوں، بیٹوں اور بھائیوں سے جدا کردی گئیں، جبکہ وہ ایسی مصیبت کا زمانہ تھا جو قیامت کا منظر پیش کررہا تھا کہ اس دن انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی، اولاد اور اہل خاندان سے بھاگتا نظر آئے گا۔ بہت سی صبح کی سہاگن

---

[1] حکیم احسن اللہ خاں جو حریت پسندوں اور دلی والوں میں بہت معتوب تھے لیکن غالب نے ان کی بہت تعریف کی ہے۔ دونوں میں گہرے تعلقات تھے۔

عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں اور شب کو آغوشِ پدر میں سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر اٹھے۔ کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں، اور کتنے مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ شہر چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل بن گیا تھا اور شہری تباہ و برباد و منتشر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی شہروں اور دیہات کی طرف مبذول ہوئی، وہاں بھی بڑا فساد مچایا۔ قتل، غارتگری اور پھانسی کا بازار گرم کر دیا۔ بے شمار مرد اور پردہ نشین مستورات موت کے گھاٹ اتر گئیں اور سینکڑوں، ہزاروں رعایا کے آدمی مار ڈالے گئے۔

میرا کیا پوچھنا، میں اپنے وطن مالوف (خیرآباد) کی طرف چلا جا رہا تھا، راستہ خوفناک اور رہگذار اندوہناک تھا۔ میرے اور وطن کے درمیان کئی خوف وخطر سے بھری ہوئی منزلیں تھیں، نصاریٰ اور ان کا لشکر، دن رات تلاش و تجسس میں سرگرداں رہتا۔ جاٹوں کو مسافروں کے مار ڈالنے، ڈرانے، لوٹنے، ڈاکہ ڈالنے کی کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی۔

انہوں نے سارے ناکے بند کر رکھے تھے اور کسی گھاٹ پر کوئی کشتی یا ناؤ تک نہ چھوڑی تھی، کشتیوں کو پھاڑ ڈالتے بلکہ خراب کر کے غرق کر دیتے یا جلا ڈالتے۔

ملاحوں کو روک دیا تھا تاکہ کوئی سیاح یا مسافر کسی وقت بھی ادھر سے نہ گذر سکے۔

خدائے مالک الملک نے مجھے اور میرے متعلقین کو ہر مصیبت و ہلاکت سے محفوظ رکھ کر، پل اور کشتی کی مدد کے بغیر، دریاؤں اور نہروں کو عبور کرا کے نجات دی۔ اور ہم سب کو آفاتِ مسافات، مہالکِ مسالک، حوادثِ راہ اور مصائب گذرگاہ سے مصؤن و مامون رکھا، اور اپنی پوری حفاظت، کامل حمایت، مکمل نعمت اور بے شمار رحمت کے ساتھ ہمیں اپنے جوار و دیار اور احباب و رشتہ دار تک پہنچایا۔ ہم خدا کی اس بے پناہ عنایت اور تمام آفات سے حفاظت پر اس کا شکر بجالائے۔

نصاریٰ کے ''باغی'' گروہوں اور ہمارے نواح کے متعدد لشکروں نے اپنے سابق معزول والی[1] کی ایک بیگم[2] اور اس کے ایک ناتجربہ کار اور ناسمجھ لڑکے[3] کو امیر و حاکم بنا ڈالا۔

نصاریٰ نے اس والی سے اس کا ملک چھین لیا تھا، وہ بڑا واہی ولاہی تھا۔ عیش وطرب میں منہمک، انتظامِ ملکی سے غافل، عقل و خرد سے بیگانہ اور نقض عہد و میثاق میں یگانہ تھا۔ نصاریٰ کی

۱۔ نواب واجد علی شاہ ۲۔ بیگم حضرت محل

۳۔ برجیس قدر

عملداری ختم ہونے پر وہ ملکہ، مالکہ بن گئی۔ اس کا لڑکا چھوٹا، ناتجربہ کار، ناز پروردہ، ہمسنوں کے ساتھ کھیلنے والا، اور دشمن سے لاپرواہ تھا۔

تدبیر امورِ مملکت، اجراء احکام اور قیادت فوج کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے اعیانِ سلطنت اور ارکانِ دولت سب کے سب نااہل، سست، بزدل، احمق، خائن اور غیر دیانتدار تھے۔ اکثر ذلیل اور بعض بندگانِ زر تھے۔

ان میں سفیہ، عیش پرست، نادان، بلند آواز، سست، منافق چرب زبان، ذلیل، غلام زادہ، حیران و پریشان، ظالم و جابر، حیلہ ساز و متکبر، خائن و مکار، بندۂ زر و غیبت خور، سبھی قسم کے لوگ تھے۔

بعض ایسے بھاگنے والے مدبّر تھے کہ ان کی تدبیر، تباہی و بربادی و ادبار کی طرف لے جاتی تھی اور صاحب نظر افراد کو عبرت کے عجیب عجیب مناظر دکھاتی تھی۔

ان میں سے اکثر نصاریٰ کے معاون و مددگار اور محبّ ووفا شعار تھے اور یہ سب کے سب دشمن کی ہلاکت خیز تدبیروں سے ناواقف اور ان کی مصلحت اندیشی سے بے خبر تھے۔

نصاریٰ اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ شہر (لکھنؤ) میں محصور مگر مخالف گروہ کی ناقص تدبیروں کی وجہ سے اپنے مکانوں [1] میں محفوظ تھے۔

نصاریٰ نے خندقیں کھود کر اور حصار بنا کر ان مکانوں کو قلعہ کی شکل دے لی تھی۔ مقابل لشکر، ان پر حملہ آور ہو کر پسپا ہو جاتا تھا۔ جو کچھ کہتا وہ کر نہ پاتا تھا۔ اسی حالت میں محصورین کی امداد کے لئے سفید رو گروہ آ گیا۔ شہر میں داخل ہونے لگا تو بہادر غازیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بہت سے گورے مارے گئے۔ باقی ماندہ دل شکستہ اور حسرت زدہ ہو کر محصورین تک پہنچ گئے۔ پھر تازہ دم ہو کر یہ مکانوں سے نکلے تو بزدلی اور کوتاہی کی وجہ سے کوئی مقابلہ پر نہ آیا۔ نصاریٰ نے شہر سے دو میل دور باغ پر قبضہ جما لیا اور قوت و بہادری سے اسی کو اپنا گڑھ بنا لیا۔ وہاں مدد پر مدد اور سامان پر سامان جمع کر لیا۔

وہ لشکر جو شہر میں پہلے سے موجود تھے اور وہ جو دہلی [2] سے بھاگ کر بیگم کی پناہ میں آ گئے تھے جن کو ملکہ نے قدر و منزلت کے ساتھ جود و بخشش سے نوازا تھا، اور تنخواہ دار سپاہیوں کا وہ جم غفیر، جو حرب و ضرب سے نابلد، اسلحہ بندی سے ناواقف، اور مصلحت و معرکہ سے ناآشنا تھا، یہ

۱۔ بیلی گارڈ

۲۔ جنرل بخت خاں و شہزادہ فیروز شاہ وغیرہما

سب اس باغ پر خندقیں کھود کر اور کمین گاہ بنا کر جا ڈٹے۔

دونوں فریقوں میں ایک مدت تک مقابلہ ومقاتلہ اور نیزہ بازی وتیراندازی ہوتی رہی۔ تنگ آ کر نصاریٰ نے پہاڑوں کے والی سے مدد مانگی۔

اس نے ان کی آرزو کے مطابق تیس ہزار سے زیادہ پہاڑی لشکر بھیج کر مدد کی۔

اب تو نصاریٰ ، ان کی گوری فوجوں ، کرایہ کے سپاہیوں اور لالچی معاونوں نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ یہ حملے بڑے سخت، متواتر، اور مسلسل تھے۔ جنہوں نے مقاتلین کو ان کی جگہ سے ہلا دیا اور ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وہ کمین گاہوں سے ایسی بری طرح بھاگے کہ شہر کی سرحدوں پر بھی نہ ٹھہر سکے۔

ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ بھاگے۔ ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکان دولت اعیانِ سلطنت نے دغا کی اور وہ دیہاتی جوان کے علاقہ میں ان کی مدد واعانت، عزت و آبرو، مال ودولت کی صیانت وحفاظت کے لئے آئے تھے، عہد شکنی کر کے اور کفر کو ایمان سے بدل کر منافق بن گئے۔ نصاریٰ کی موافقت اور رفاقت کرنے لگے۔ نصاریٰ مع معاونین شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے رہنے والے گھروں کو خالی کر کے نکل گئے۔

نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس محل شاہی کا جس میں ملکہ تھی محاصرہ کر لیا۔ بیگم اپنے ولی عہد اور دو سہیلیوں کو لے کر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلہ میں تیزی سے پیدل پہنچ گئی۔ تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس کرنے، اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی، وہ لشکر ایسا دہشت زدہ ہو چکا تھا کہ کسی صورت سے اس نازک موقعہ پر دستگیری کو تیار نہ ہوا۔ نہ ان میں سے کوئی متنفس لوٹا اور نہ شہر بھر میں کہیں جائے پناہ ہی رہی، آخر کار بیگم اپنے اعوان وانصار سے مایوس ہو کر، ولی عہد اور چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر، چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل کی طرف چل کھڑی ہوئی، اب اس کے گرد، کمزور دل سواروں کی کچھ جماعتیں، پیدل مردوں کا انبوہ کثیر، شہریوں اور عزت دار عورتوں کی کافی تعداد آ کر جمع ہو گئی، وہ شہری ننگے بدن اور ننگے پاؤں تھے، حالانکہ سرداروں میں سے تھے، اور عورتیں ننگے پاؤں اور بے پردہ تھیں حالانکہ گرامی قدر، پردہ نشین اور محل سراؤں کی رہنے والی تھیں، وہ سرسبز وشاداب خطوں سے چٹیل میدانوں کی طرف پھینکیں گئیں، وہ پیوندوں کے کپڑے پہن کر ستر پوشی کرتی تھیں اور برقعے نہ ہونے سے اسی پر اکتفا کرتیں، ایک میدان سے دوسرے میدان میں پہنچتیں، بے پردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا، وہ عیش وعشرت میں زندگی بسر کرتی تھیں، پھر دور دراز

جنگل اور پر خطر میدان میں ڈال دی گئیں۔ ان لوگوں کو محلات، پائگاہیں اور ریاستیں چھوڑنا پڑیں، حالانکہ وہ ان سے ذرا بھی ہٹنا نہ چاہتے تھے، یہاں تک کہ حال متغیر، وبال نازل اور ہلاکت عام ہوگئی۔ یہ ایسی مہلک مصیبت نازل ہوئی جس نے شہروں کو میدان، آزادوں کو غلام، مالداروں کو فقیر و مسکین اور شریفوں کو خوار و ذلیل بنادیا۔ وہ اپنے اہل و عیال میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کررہے تھے، خوش حال اور فارغ البال تھے کہ مجبور ہوکر نکلنا پڑا۔ فقیری و تنگدستی نے ہمسنوں کی مجالست اور اضطراب واضطرار نے برابر والوں کی رفاقت سے دور کردیا۔

رونے والے آہ و زاری، بیمار فریاد و شیون کرتے، آرزومند چلاتے اور حسرت کشیدہ انا للہ پڑھتے، بچے، اپنی ماؤں کے سینوں سے قبل از وقت جدا کردیئے گئے تھے، بوڑھے اور جوان حاجتوں کے پورا کرنے سے ناامید تھے، نہ ان کا کوئی ٹھکانا تھا نہ بیماری کی دوا تھی، ان کے دل خالی تھے، ان میں نہ کوئی خواہش تھی نہ انہیں کوئی بات بھاتی تھی، زندگی اور موت ان کے لئے دونوں برابر تھے، وہ مسرت و شادمانی، تخت شاہی، دیباج و حریر، میوے، خوش طبعی، عیش و عشرت، نظافت و نزاہت، نزاکت و نعمت، نغمۂ سرود، مال و دولت، خیر سگالی و مروت میں پلے تھے، آج ان کی راہ میں کانٹے ہیں، سامان زادِ راہ کا پتہ نہیں، کپڑے بوسیدہ ہیں اور عیش و راحت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انہیں معاف کرے اور ظالموں کو سخت گرفت میں لے۔

پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ، اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آگیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور نہروں سے گذری جن سے بغیر کشتی کے عبور مشکل و دشوار تھا۔

وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہوگئی، اور دریا کے گھاٹوں پر سوار، پیادے بٹھادیئے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیں اور دشمنوں کو دریا عبور نہ کرنے دیں۔

اس نے انتظامِ رعایا اور حصولِ خراج کے لئے، شہروں اور قصبات و دیہات میں عامل بھیج دیئے، لشکروں کو آراستہ کرکے اپنے اس دارالسلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہوچکا تھا، بھیج دیا۔ تاکہ اگر دشمن ادھر کا قصد کرے تو اس سے ڈٹ کر مقابلہ و مقاتلہ، مزاحمت و مجادلہ کیا جائے۔

لیکن یہ تمام امور مہمہ اور ان کا اہتمام و انصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل (نواب احمد علی خاں عرف ممو خاں) کو سونپا گیا تھا جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ وہ صحیح مشورہ سے گریزاں اور جہل سے ہمکنار تھا۔ آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا، وہ ذلیل احمق اور بزدل تھا۔

اس نے مکالمہ اور مشاورت، مجالست اور منادمت کے لئے احمق، جاہل اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا۔ وہ نخوت وغرور کی بنا پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب وحاکم بناتا۔

چنانچہ اس ناتجربہ کار نے ان لشکروں پر کمین، ذلیل، بزدل اور رذیل لوگوں کو سردار بنادیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے۔ جو کچھ لشکریوں کو خوراک وغیرہ دی جاتی، کھاجاتے۔ وہ بددیانت تھے۔ اپنی کینہ پروری کی وجہ سے ان کے غلّہ اور جنس میں خیانت کرتے اور گراں فروشی کے مرتکب ہوتے، ہر آواز کو دشمن کی آواز سمجھتے، ہمیشہ اضطراب کے ساتھ خوف کی وجہ سے لرزتے رہتے۔ کسی وقت بھی ان کو راحت وسکون میسر نہ تھا، بزدلی سے ہر آواز کو موت کا پیش خیمہ اور ہر صدا کو موت کی پکار سمجھتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمینے دشمنوں کے سامنے محبت وحاجت کے ساتھ پیش کئے جارہے ہیں۔

نصاریٰ دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں ڈٹے رہے۔ اطراف وجوانب کی طرف نہ نکلے۔ انہوں نے گردونواح کے کافروں، دیہاتیوں اور کاشتکاروں کی تالیفِ قلب شروع کردی، ان کی خطاؤں کو درگزر، ان کے خراج میں تخفیف، اور تاوانوں میں کمی کی۔

اس مہربانی پر وہ مطیع وفرمانبردار اور معاون ومددگار بن گئے۔ ادھر سے مطمئن ہوکر، اطراف ملک میں شہرودیہات پر قبضہ کرنے کے لئے نصاریٰ نکل کھڑے ہوئے۔

جب نصاریٰ اس مرصد (نواب گنج ضلع بارہ بنکی) کی طرف متوجہ ہوئے جو دارالسلطنت سے جانب شمال آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور جس میں سوار، پیادے، اور وہ رذیل وذلیل قائد عظیم بھی تھا تو وہ کمین قائد ان کی آمد کی خبر سن کر ہی اپنے ذلیل سرداروں کے ساتھ بھاگ گیا۔ بہادر ہندوؤں کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤں کے بہادر مکھیا کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئی۔ یہ سو سے زیادہ نہ تھے۔ دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے۔

وہ فرار کی عار برداشت نہیں کرسکتے تھے اور بھگوڑے قائد کی طرف سے کافی لشکر اور سازوسامان کے ہوتے ہوئے بھی انہیں کوئی مدد نہیں پہنچ سکی تھی۔ نصاریٰ نے جب اس گاؤں کو جس میں وہ نامرد خائن عامل نگہداشت کے لئے موجود تھا، خالی اور ویران پایا تو اس پر قبضہ جما کر اپنا مضبوط ومحفوظ قلعہ بنالیا۔

وہیں فوج جمع کرلی اور مدت تک وہیں مقیم رہے وہ ایک میل بھی نکل کر نہ گئے۔ وہ سردارانِ لشکر کی امیدوں کی تکمیل، اور ان خائنوں کے ایفاء عہود کے منتظر تھے۔ اسی لئے اپنے

ایفاء وعدہ میں بھی تاخیر کر رہے تھے۔

ادھر سے فارغ ہو کر انہوں نے اس مغربی گوشے کا رخ کیا جہاں کے تمام باشندے ان کے مطیع ہو چکے تھے اور دشمنوں پر ان کے معاون تھے۔ وہاں بھی ملکہ کی طرف سے، ناعاقبت اندیش، غیر مدبّر، ناتجربہ کار، اور ذلیل عامل تھا، وہ بھی پیٹھ پھیر کر مقابلہ کئے بغیر بری طرح بھاگا۔ سرنگ میں ہو کر اپنا راستہ بنایا، اس کے پاس سوار اور پیادے بھی کم تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہاتیوں نے معاہدہ وقسم کے باوجود وقت پر دغا کی۔ غدر و مکر کی انتہا کر دی۔

نازونعمت اور پر عیش ومسرت زندگی کا کفران کیا، معاہدوں سے انکار کر کے کفر میں اضافہ اور ارتداد میں زیادتی کر لی۔

اس موقعہ پر متسلط نصاریٰ سے قتال کے لئے دوسری طرف کا ایک عامل (مولوی احمد اللہ مدراسی[1]) اٹھ کھڑا ہوا، اس نے خیرات ومبرّات اور سعادات وحسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔ وہ بڑا ہی، پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر، اور رسولِ ملاحم اور نبی مراحم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام تھا۔ اسلئے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی حملہ میں شکست دے دی۔

اپنی ساری کوششیں ختم کر کے وہ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط ومحفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اور عظماء نصاریٰ کے پاس شہر میں پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ انہوں نے ایک لشکر اور منافقین ودباقین کا جم غفیر جنہوں نے عہد شکنی کی تھی ان محصورین کی مدد کو بھیج دیا۔

ادھر اس نیک سرشت بہادر عامل سے ایک دیہاتی کافر زمیندار (بلدیو سنگھ راجہ پوائیں، ضلع شاہجہانپور) نے بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ پر آ جائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا،

جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمیندار کی قسموں پر بھروسہ کر کے اس دیانتدار عامل نے

۱۔ مولوی احمد اللہ مدراس کے رہنے والے اور احیائے اسلام کے کٹر حامی تھے۔ ان کی داستان سفر طویل اور مجاہدانہ کارنامے حیرتناک ہیں۔ فیض آباد میں قیام کرنے سے پہلے وہ راجپوتانہ، سانبھر، جے پور، ٹونک اور گوالیار میں رہ چکے تھے۔

لکھنؤ کا دفاع ناممکن ہو جانے کے بعد شاہجہاں پور میں ''محمودی مورچہ'' بنا کر ڈٹ گئے۔ ''حاجی دین محمد'' کا لقب اختیار کیا اور اپنے روحانی مرشد محراب شاہ کے نام کے سکے جاری کئے۔ (انتظام اللہ شہابی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۹-۴۸)

اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے تو بندوقوں اور توپوں سے، چہروں اور سینوں پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں اور پیچھے سے اس غدار مکار زمیندار کی جماعت نے پشت و سرین کو پھوڑنا شروع کیا۔

وہ دراصل نصاریٰ کے انصار واعوان وشیاطین کے اتباع واخوان تھے۔

وہ خدا پرست عامل معرکہ میں گر کر شہید ہوا اور اس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقشِ قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔ ان سب ابرار و اخیار کی شہادت کے بعد بزدل لوگ ایسے بھاگے کہ نامردی اور اضطرار سے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا، نصاریٰ نے تعاقب کر کے ان سب کو پکڑ کر قتل کر ڈالا، تھوڑے سے وہ بچ رہے جنہوں نے بھاگنے میں پوری تیزی اور عجلت سے کام لیا۔

اس نواح کے سارے باشندے دہقانی، کاشتکار، مکھیا، او رمقدم وغیرہم سب مطیع و فرمانبردار بن گئے البتہ دو بہادر، غیرتمند اور غارتگر جوانمردوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔

اپنی بے پناہ شجاعت و بسالت سے قلت اسباب و جماعت کے باوجود دشمن کے ہزاروں سوار، پیادے ٹھکانے لگا دیئے۔ آخر کار مجبور ہو کر اپنی بہادری سے جان بچا کر نکل گئے اور دشمن ان کا تعاقب نہ کر سکا۔ اب وہ نواح بھی صاف ہو گیا۔ ان دونوں سرداروں کی شکست کے بعد، مخالفوں کے دل میں دشمن کا رعب قائم ہو گیا۔

یہ واقعہ رنجیدہ واقعات میں سے سب سے اہم اور آخری واقعہ اور اس جنگ کا خاتمہ تھا۔ نصاریٰ یہاں غالب ہونے کے بعد دوسرے اطراف میں پھیلنا شروع ہوئے۔ وہ جب کسی طرف کا قصد کرتے تو وہاں کے رہنے والے غم وفکر میں مبتلا ہو جاتے اور لڑے بھڑے بغیر شکست مان لیتے۔

ان تمام فتح مندیوں کے بعد بھی ملکہ نصاریٰ (وکٹوریہ) مکر سے باز نہ رہی۔ اس مکر کی وجہ سے انہیں بڑی قوت و طاقت حاصل ہو گئی، اس نے تمام دیہات، شہروں اور قصبوں میں مطبوعہ حکمنامے جاری کئے جن میں عام معافی کا اعلان کیا۔ کہ تمام "باغی" لشکر اور سرکش و نافرمان رعایا کو، ان لوگوں کو چھوڑ کر معاف کیا جاتا ہے جنہوں نے عورتوں، بچوں اور ان نصاریٰ کو جنہوں نے مجبور ہو کر پناہ لی تھی، ظلم وعداوت سے قتل کر ڈالا۔

یا وہ جنہوں نے سلطنت و ریاست قائم کی۔ یا وہ جنہوں نے سرکشی وعدوان پر لوگوں کو ابھارا، ادھر وہ "باغی" لشکر اور دوسرے بیگم کے ساتھی، روزی کے نہ ہونے اور تنخواہ وضروریات

زندگی میسر نہ آنے سے پریشان ہو چکے تھے۔

نصاریٰ کے مسلط و منتشر ہو جانے کی وجہ سے بیگم کے پاس خراج اور محاصل کا آنا بند ہو گیا تھا، زمین کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی، وہ بڑی سخت مصیبت و تنگی میں پڑ گئے تھے۔ وہ سب تنگدست، اور عیش و راحت سے دور تھے، ان کے دل اہل و عیال کی جدائی سے پارہ پارہ تھے،

ایسے حالات میں مجبور و مضطر ہو کر بہت سے لشکری وغیرہ نصاریٰ کے اطاعت گذار بن گئے، ان کے پاس ہتھیار، گھوڑے جو کچھ تھا چھین لیا گیا اور پروانۂ امان دے دیا گیا۔ اب وہ اہل وطن کی طرف خائب و خاسر ہو کر لوٹے۔

پھر تو نصاریٰ سارے ملک پر بلا مزاحمت قابض ہو گئے۔ میدان کارزار اور لڑائیوں سے نجات پا گئے۔ بیگم اس تباہی و بربادی کے بعد، بچے کھچے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں (سرحد نیپال) پر چلی گئی۔

میں مسافرت و غربت، اضطراب و مصیبت کی زندگی گذار رہا تھا اور میرا اشتیاق و رغبت، اپنے گھر، اہل و عیال، پڑوسی اور احباب تک پہنچنے کے لئے بڑھ رہا تھا کہ امن و امان کا وہی پروانہ جسے قسموں سے مؤکد کیا گیا تھا، نظر پڑا، اس پر بھروسہ کر کے اپنے اہل وطن میں پہنچ گیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم و یمین پر اعتماد کسی حالت میں درست نہیں، خصوصاً جبکہ وہ بے دین جزا و سزائے آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔

تھوڑے دن کے بعد ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کر دیا اور رنج و غم میں مبتلا و مقید کر کے دارالسلطنت (لکھنؤ) جو دراصل اب خانۂ ہلاکت تھا بھیج دیا، میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا اور میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تندخو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مصر تھے انہوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

اس ظالم حاکم[1] نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اور میری کتابیں، جائیداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان، غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس

۱۔ ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں مولانا پر مقدمہ چلا۔ وہ اپنی بے گناہی پر اصرار اور رہائی کی التجا کرتے رہے مگر انہیں باغی قرار دے دیا گیا۔

شرمناک رویہ کا تنہا میں ہی شکار نہ بنا تھا بلکہ بہت سی مخلوق سے اس سے بڑھ چڑھ کر ناروا سلوک روا رکھا گیا، انہوں نے عہد و پیمان توڑ کر ہزاروں مخلوقِ خدا کو پھانسی، قتل، جلاوطنی اور قید و حبس میں بلا تاخیر مبتلا کر کے، وعدہ خلافی کر کے بے شمار نفسوں اور لاتعداد نفیس چیزوں کو تباہ کر ڈالا۔

اس طرح خونِ ناحق شمار سے آگے بڑھ گیا۔ سینکڑوں اور ہزاروں سے گنتی نہیں ہوسکتی، اسی طرح شریف غیر شریف قیدیوں کی تعداد حد سے متجاوز ہے، خصوصاً دہلی اور ہمارے دیار کے مابین وسیع علاقے میں، جہاں شریف و عظیم خاندانوں کے شہر کے شہر، گاؤں کے گاؤں اور قصبے کے قصبے آباد ہیں۔

ان شرفاء و عظماء کے پاس ایک رئیس نے جو اسلام و ایمان کا مدعی بھی تھا، دارالریاستہ میں طلبی کے ساتھ امن و امان کا پیغام بھیجا۔ وہاں پہنچنے پر اپنے وعدے سے پھر کر نصاریٰ کی خوشنودی کی خاطر غداری کر کے ان سب کو گرفتار کر لیا، بدعہدی سارے مذاہب میں مذموم و ممنوع ہے اس کا بھی لحاظ نہ کیا، یہ بدبخت نصاریٰ کی رضا جوئی میں خدائے عزیز و منتقم کے غصہ سے بھی نہ ڈرا۔ نصاریٰ نے ان سب کو ہتھکڑی اور بیڑی پنا کر محبوس کر دیا۔ اکثر شرفاء کو قتل اور باقی کو، قید، جلاوطنی اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا، اس طرح وہ بدنصیب رئیس بھی نصاریٰ کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو سخت عذاب میں مبتلا کرنے کی وجہ سے نصاریٰ کے انعام و اکرام کا مستحق بن گیا۔

یہ المناک کہانی یوں ختم ہوئی۔ اب میرا ماجرا سنئے، مکر و تلبیس سے نصاریٰ نے جب مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا، مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا، میرا جوتہ اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم و بہتر بستر چھین کر، خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیئے گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں، میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ محبانِ مخلص کی آبِ محبت کے بجائے گرم پانی اور ناتوانی و کبر سنی کے باوجود ذلت و رسوائی سے ہر وقت سامنا رہا۔

پھر ترش رو، دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا۔ اس میں دشوار گذار گھاٹیاں اور راہیں تھیں، جنہیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی،

اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں، اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا، اس کا بادل رنج وغم برسانے والا، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں اور اس کی ہوا ذلت وخواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی، ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا، میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں، ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی، مرض سستا اور دوا گراں، بیماریاں بے شمار، خارش وقوباء (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی، بیمار کے علاج، تندرست کے بقاء صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔

معالج، مرض میں اضافہ کرنے والا اور معالج، ہلاک ہونے والا، طبیب تکلیف و رنج بڑھانے والا تھا۔ رنجیدہ کی نہ غمخواری ہی کی جاتی نہ اس پر رنج وافسوس کا ہی اظہار ہوتا، دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی المناک مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی، یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے، بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علتِ تام ہے، بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام ونشان نہیں، نصرانی ماہر طبیب، مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے اوپر بناتا ہے۔ مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منہ کے قریب پہنچا دیتا ہے، جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب جو در حقیقت شیطان خناس یا دیو ہوتا ہے، اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا، غسل وکفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے، نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے۔ نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

یہ کیسی عبرتناک والم انگیز کہانی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا تو اس جزیرہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی، اور اچانک موت سب سے زیادہ تسلی بخش تھی، اور اگر مسلمان کی خودکشی مذہب میں ممنوع، اور قیامت کے دن عذاب وعقاب کا باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں مقید ومجبور بنا کر تکلیف مالایطاق نہ دیا جاسکتا، اور مصیبت سے نجات پالینا بڑا آسان ہوتا۔

یہ ناقابل برداشت حالات تھے ہی کہ میں متعدد سخت امراض میں مبتلا ہوگیا جس کی وجہ سے میرا صبر مغلوب، میرا سینہ تنگ، میرا چاند دھندلا اور میری عزت ذلت سے بدل گئی، میں نہیں جانتا کہ اس دشوار وسخت رنج وغم سے کیونکر چھٹکارا ہوسکے گا۔ خارش وقوباء میں ابتلاء اس پر مستزاد ہے۔ صبح وشام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے، روح کو

تحلیل کر دینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچا دیں، ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عیش و مسرت، راحت وعافیت میں زندگی بسر ہوتی تھی، اب محبوس و قریب ہلاکت ہوں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب محسودِ خلائق غنی، اور صحیح و سالم تھا، اب اپاہج اور زخمی ہوں، بڑی سخت مصیبتیں اور بیسیوں صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی ہیں۔

ٹوٹی ہوئی ہڈی جس طرح لکڑی اور پٹی کا بوجھ اٹھاتی ہے اسی طرح ہم بھی ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔

ان تمام مصائب کے باوجود اللہ کے فضل و احسان کا شکر گزار ہوں کیونکہ اپنی آنکھوں سے دوسرے قیدیوں کو بیمار ہوتے ہوئے بھی، بیڑیاں پہنے ہوئے زنجیروں میں کھینچے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں، انہیں لوہے کی بیڑیوں اور زنجیروں میں ایک سخت، تیز اور غلیظ انسان کھینچتا ہے، محنت و مہنت، کینہ و عداوت کا پورا مظاہرہ کرتا ہے۔ تکلیفوں پر تکلیفیں پہنچاتا اور بھوکے پیاسے پر بھی رحم نہیں کھاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان آفات و تکالیف سے محفوظ رکھا۔

میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں، اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں۔ میرے دوست میرے مرض کے مداوا سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہوگیا ہے۔ ان کے پلید سینے کینہ و عداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔

ان ظاہر اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی نجات سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں، لیکن اپنے رب عزیز و رحیم، رؤف و کریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں، وہی تو جابر فرعونوں سے عاجز ضعیفوں کو نجات دلاتا ہے اور وہی تو زخمی مظلومین کے زخموں کو اپنے رحم و کرم کے مرہم سے بھرتا ہے۔ وہ ہر سرکش کے لئے جبار و قہار ہے، ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنے والا، ہر نقصان رسیدہ فقیر کا کامیاب بنانے والا اور ہر دشوار کو آسان کرنے والا ہے۔

اسی نے نوح علیہ السلام کو غرق، اور ابراہیم علیہ السلام کو تپش و حرق، ایوب علیہ السلام کو مرض و معائب، یونس علیہ السلام کو شکم ماہی اور بنی اسرائیل کو بربادی و تباہی سے نجات دی۔

اسی نے موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو ہامان و فرعون و قارون اور عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو مکر ماکرین اور اپنے حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دجل و فریب کفار پر غالب کیا۔ پھر اگر مجھے مشقتوں صعوبتوں اور حوادث و معاصی نے گھیر لیا ہے تو اس کی رحمت و فضل سے کیوں مایوس ہوں، وہی میرا رب، شافی و کافی اور خطاپوش و آمرزگار ہے،

بہت بیمار جو موت کے کنارے پر پہنچ کر بھی اسے یاد کرتے ہیں شفا پاتے ہیں، بہت خطا کار جب استغفار و استغفار کرتے ہیں مقبول بارگاہ ہوتے ہیں ۔ بہت دردمند جب اسے پکارتے ہیں مصیبت سے نجات پاتے ہیں ۔ بہت مسافر جب اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں، مراد کو پہنچتے ہیں، بہت قیدی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، خلاق مطلق انہیں بیڑیوں اور قیدوں سے بلا فدیہ و احسان، چھٹکارا دلاتا ہے۔

میں بھی مظلوم و دل شکستہ و مضطر اور مسکین و ذلیل و محتاج بنکر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں، اس کے حبیب کو وسیلہ بنا کر اور امیدوار رحمت ہو کر اس کی بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا، اس نے مظلوم و مضطر کے یاد کرنے پر اجابتِ دعوت اور کشفِ مصیبت کا وعدہ کیا ہے[1]۔

وہی مجھے تکلیف سے نجات دیگا، وہی قلق و اضطراب سے آزاد کرے گا، وہی امراض سے شفا بخشے گا، وہی پکڑنے والے سے چھڑائے گا، وہی ظالم سے بچائیگا، وہی میری گریہ و بکا پر رحم کریگا، وہی میری بدبختی و شامت کو مٹائے گا۔ وہ دعا کا سننے والا، بہت دینے والا، اور بلاؤں کا دفع کرنے والا ہے۔

اسی سے جلاوطنی کے غم کو دور اور بہترین نعمتوں کے عطا کرنے کی امیدیں وابستہ ہیں۔

اے میرے رب! مصیبتوں سے مجھے نجات دے، اے امیدواروں کے امیدگاہ اور اے التجا کرنے والوں کے پناہ گاہ! اپنے حبیبِ امین، اس کی آل طاہرین و مبارکین اور اس کے صحابہ محافظینِ دین کے صدقے میں ہماری سن لے، اے ارحم الراحمین اور اے احکم الحاکمین! تو ہی ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے، بے شک ساری تعریفیں سارے جہان کے پالنے کے لئے ہیں۔

یہ پردرد و الم انگیز کہانی ختم ہوئی، میں نے اپنی مصیبت و پریشانی کا کچھ حال دو

ا۔ مولانا کی گرفتاری اور جزیرہ انڈمان میں قید کے بعد بھی ان کی رہائی کی کوششیں جاری تھیں۔ مولانا خود تو بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا ہی رہے تھے، ان کے صاحبزادہ مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر (میر منشی لیفٹنٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ) بھی ان کی رہائی کے لئے کوشاں تھے۔

بالآخر مولانا کی بے گناہی ثابت ہوئی اور مولوی شمس الحق پروانہ رہائی لے کر جزیرہ انڈمان روانہ ہوئے لیکن جب جہاز سے اترے تو ایک جنازہ نظر آیا جس میں بہت زیادہ لوگ شریک تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو مولانا فضل الحق خیرآبادی قید ہستی سے چھوٹ گئے۔ مولانا کی رہائی کا حکم اور قید ہستی سے نجات ان کے مستجاب الدعوات ہونے کا ثبوت ہے۔

قصیدوں میں بھی لکھا ہے، ایک قصیدہ ہمزیہ ہے جس میں شیطانی وساوس کا ذکر ہے اور دوسرا دالیہ ہے جس میں اس غمگین ومعذور کی تکلیف ورنج کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں قصیدوں کو سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی مدح پر ختم کیا ہے۔ ان دونوں سے پہلے ''نون'' کے قوافی میں بھی قصیدہ لکھا تھا۔ جو درِّ یتیم کی طرح فرید و یگانہ ہے،[1] اس کا ہر شعر مضبوط و مرتفع قصر کی طرح ہے، اس کے تین سو سے کچھ زیادہ اشعار ہو کر رہ گئے۔ اس کے اتمام کی نوبت نہیں آئی، مصائب و آلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

ما ناح اورق فی اوراق اشجان

الا وھیج اشجانی و اشجانی

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے احسان فرمایا تو اس ذات کی مدح اس میں شامل کر کے ختم کروں گا جسے مکارم اخلاق سے پورا پورا حصہ ملا ہے۔ اس پر اور اس کی آل پر قیامت تک صلوٰۃ و سلام واللہ سبحانہ ولی التوفیق والاکرام۔

☆☆☆

۱۔ کالی داس گپتا رضا نے اپنی کتاب ''غالبیات۔ چند عنوانات'' (ص ۱۱۱۔ ۱۱۸) میں اس قصیدے کی تفصیل بیان کی ہے:

> ''میرے کتب خانہ میں عربی کی ایک قلمی کتاب ہے جس میں سات چھوٹے بڑے رسائل شامل ہیں جن کو مصنفین کے اصل خطی نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔ ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے چھوٹی بڑی بحروں میں ۱۶ قصیدے ہیں۔ ۳ قصائد نونیہ ہیں۔ ایک قصیدہ نونیہ کا موضوع انگریزوں کے ہاتھوں دلی کی تباہی و بربادی اور مصنف کا دلی سے نکلنا ہے۔''

قصیدہ ہمزیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دل سے میرے پہلو کی ہڈیوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ آنسو خشک اور اندرونی اعضا پگھل گئے ہیں۔

مجھ پر نازل شدہ مصیبتوں اور میری اہل وطن سے دوری پر دوست روتے اور دشمن خوش ہوتے ہیں۔

میں عزت وعظمت کی زندگی بسر کر رہا تھا جو شرفاء وعظماء کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔

میرے درد وغم اور تباہی و ہلاکت پر دوست غمگین و حیران ہیں اور چارہ گروں نے تیمارداری میں برا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔

میرے اس تغیر حال، چغلخوروں کی خبر رسانی، اور مخبروں کی ریشہ دوانی پر دشمن خوشیاں منا رہے ہیں۔

رنج نازل اور غم ہم پر طاری ہو گیا۔ اور ہماری دوری میں کھنگی و سختی ہے۔

بڑی بڑی مصیبتوں نے گھیر لیا، جن کی وجہ سے ہڈیاں کمزور اور اعضا ریزہ ریزہ ہو گئے۔

مجھے ایک عورت کے مکر نے مبتلائے مصائب کر دیا، عورتوں کا مکر بڑا ہی زبردست ہے۔

یہ عہد و پیمان کر کے مخلوق کو فریفتہ بنا لیتی ہیں پھر ان کے عہد و میثاق کو وفا و قرار نہیں۔

اس نے یہ کہہ کر شہرت دی کہ جو لوگ گھر سے دور پڑے ہیں انہیں امن دے دیا گیا۔

ایسے لوگ اس کے اعلان امان سے دھوکے میں آ کر اپنے گھروں کو خوش خوش واپس ہو گئے۔

میں بھی کافرۂ متسلط کے اعلانِ امان سے فریب کھا کر مکان پہنچ گیا۔

پھر تو حکام سلطنت نے اس کے عہد و میثاق کی پروانہ کرتے ہوئے سختی شروع کی اور میری بھی طلبی ہو گئی۔

انہوں نے مجھے روک لیا اور خوب اذیتیں پہنچائیں، گویا کہ اس عہدِ ملکہ میں ایفاءِ عہد کی نیت بھی نہ کی گئی تھی۔

جب میں قیدی بن کر بھی ان کا اطاعت گذار نہ بنا تو ان کی طرف سے رنج و تکلیف میں

اور بھی زیادتی کردی گئی۔

میں خوشگوار عیش وعشرت میں تھا، پھرغموں کا ہجوم اور مصائب کا ناگہانی ورود ہوا۔

ان کے سینوں کو کینوں نے بھر دیا، ان کی زبانوں پر بھی بغض کی وجہ سے دشمنی ظاہر ہونے لگی۔

انہوں نے مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا، میں اس زندگی سے دل برداشتہ ہوگیا اور میں اس پرمسرت زمانہ کو بھول گیا جس میں آسانی تھی۔

میرے رات، دن سخت گرمی اور اندھیرے میں گذرتے ہیں، گویا کہ سخت موسم گرمی کے دن اور آخر ماہ کی اندھیری راتیں ہیں۔

پس رات تو دوامی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی صبح نہیں ہے اور نہ دن کے لئے شام اور رات ہی ہے۔

مجھے سب تصرفات سے روک کر ایک کوٹھری میں ٹھہرا دیا جس میں زہریلی ہوا کے سوا اور کسی قسم کی ہوا نہ پہنچ سکتی تھی۔

یہ کیسی مصیبت تھی۔ اس کوٹھری کی دیواریں انسانی اعضاء کو بھونتی تھیں اور اس کی مٹی تپتی ہوئی زمین تھی۔

کیسا پریشان کن قید خانہ تھا، نہ تو اس کے میدان میں پیشاب خانہ تھا نہ اس کے پاخانہ میں آب دست خانہ تھا۔

انہوں نے سختی کے ساتھ، دوستوں، بھائیوں اور بیٹوں کو مجھ سے ملنے سے روک دیا۔

میرے کپڑے چھین کر مجھے تہبند اور کملی پہننے کے لئے دے دی گئی۔

کپڑے اتار کر قیدیوں کی کملی پہنادی، میرے پاس اس خراب کملی کے سوا کوئی دوسری چادر نہ رہی

میرے برتن اور جوتے بھی ظلماً چھین لئے، میرے استعمال کے لئے کوئی برتن اور پیالہ بھی باقی نہ چھوڑا۔

میرے ننگے پاؤں رہنے پر کوئی مہربانی سے پوچھنے والا بھی نظر نہ آیا حالانکہ اس کملی اوڑھنے سے قبل مجھے مجد وشرف حاصل تھا۔

میرے بہت سے مہربان، مخلص اور صاف دل دوست، جن کی محبت، صدق وصفا پر مشتمل تھی۔

انہیں روک دیا گیا، وہ میری ملاقات، بات چیت اور زیارت سے مجبوراً محروم رہے۔
وہ مجھے ننگے پاؤں دیکھتے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے، اور میری برہنہ پائی پر ان سے جھگڑا کر بیٹھتے۔

قید خانے میں میرے پاس کوئی خادم بھی، ایذا رسانی کے ازدیاد کی وجہ سے نہ چھوڑا۔
صبح وشام بے چینی سے گذرتے ہیں، کانٹے اور چنگاریاں، بستر کے بجائے مقدر ہو چکی ہیں۔

بہت سے سفید رنگ، شرابخوار، اور میگون مونچھوں والے دشمن مجھ پر ظلم و بیداد کرتے ہیں۔
وہ سیاہ جگر، سفید فام، نرم جلد اور سخت قلب واقع ہوئے ہیں۔
وہ بدبخت و بے شرم ہیں، انہیں نہ ننگ و عار ہے نہ غیرت وحلم وحیا ان کے پاس ہو کر گذری ہے۔

بڑے جھگڑالو اور سخت دل ہیں، ان میں نرمی، اور مادۂ حمایت وحمیت نام کو نہیں۔
سارے عیوب ان میں موجود ہیں، مردوں میں سرکشی اور عورتوں میں حرام کاری پائی جاتی ہے۔

ان سب کی بدمعاشیاں، مردوں کی سرکشیاں، عورتوں کی حرام کاریاں، فسق و فجور کی اشاعت وکثرت کا سبب بنی ہوئی ہیں۔
ظلم وستم کے لئے میری قید ہی کافی نہ سمجھی بلکہ جلا وطنی اور غربت و مسافرت کی سزا بھی دی۔

قید کر کے مجھے ایسے پہاڑ پر رات میں وہ لے گئے جہاں پہنچ کر قیدی ہلاک ہو چکے ہیں۔
اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو دریا گھیرے ہوئے ہیں، موت کے سوا اس کا کوئی صحن نہیں۔
یہاں کی آب وہوا ناموافق اور آنے والے کے لئے وبال ہے، وبائیں ہر طرف عام ہیں۔

یہاں شریف وعزیز، ذلیل وگریہ کناں ہیں، دوا ناپید اور بیماریاں بے شمار ہیں۔
اس کی گھاٹیوں میں عقوبت وہلاکت عام ہے۔ اس میں دوا، دارو بھی بیماری میں اضافہ کرتی ہے۔

اس میں نہ تو پیاسے کے حلق سے پانی اترتا ہے اور نہ بھوکے کو غذا ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔
ماش کی دال غذا ہے۔ گوشت، پیاز، ترکاری، ککڑی کچھ میسر نہیں۔

وہ دریا کا کنارہ ہے۔ جہاں میدان، مہربان، گیہوں اور شیرینی، کسی چیز کا پتا نہیں
قیدیوں کے گروہ کے گروہ مر چکے، جو بچے ہوئے ہیں وہ نہ مردوں میں ہیں نہ زندوں
میں۔

میت کی نمازِ جنازہ، قبر، کفن اور پوشش کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔
یہاں ننگے کیلئے کوئی عار اور طالب احسان محتاج کیلئے سوال کی حیا نہیں۔
وہ ایسی خراب جگہ ہے جہاں طاقتور انسان پر بھی رہنے کے بعد زرد پتوں کا غلبہ
ہوجاتا ہے۔
قیدیوں کو ایسی مشقت میں مبتلا کیا گیا کہ ان کی ایذاء ہلاکت کے درجہ تک پہنچ گئی۔
ان کے کینوں کی وجہ سے قیدیوں کی بیڑیاں مضبوط ہوگئیں اور تھکن نے دشواری میں
ڈال دیا۔
بلاؤں اور سختیوں نے انہیں ہلاک کیا اور چوکیداروں اور مصیبتوں نے رنج میں مبتلا
کردیا۔
ان کی غم انگیز تشنگی اور بھوک پر پیاس، قلتِ غلّہ اور گرانی نے بھی مبتلائے مصیبت کردیا۔
انہوں نے مجھے ایسے مہلکہ میں ڈال دیا جہاں زمین، زمین ہے نہ آسمان، آسمان۔
اس کا قریبی آسمان وہ بادل ہیں جن کی بارش غموں کا سیلاب ہے اور اس کی زمین
سنگریزے ہیں۔
اس میں بارش نہیں ہوتی، گرمی کی شدت سے فضاءِ آسمانی سے بخارات کا پسینہ گرنے لگتا
ہے۔
بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے، جس کی وجہ سے دن میں سورج [1] اور رات کو چاند
نظر نہیں آتا۔
رات میں تو اندھیرے پر اندھیرا چھایا رہتا ہے اور دن اندھیری رات کی طرح ہے۔
اس میں سورج والا کبھی دن نہیں ہوتا اور نہ چاندنی والی راتیں ہوتی ہیں۔
اس کے سیاہ افق پر کسی نے چاند نکلتا نہیں دیکھا اور نہ گرگٹ ہی سورج دیکھ سکا۔
وہ خود تاریک ہے اور تاریک دریا سے گھرا ہوا ہے۔ اس دریا میں نہ موتی ہے نہ روشنی۔
یہاں کی فصل بہار و خزاں میں کوئی فرق نہیں، یہاں نہ گرمی، گرمی ہے نہ جاڑا، جاڑا۔

۱- مولانا کے اس بیان سے ان کے بعض دوسرے بیانات کی تردید ہوتی ہے مگر یہاں ان پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

یہاں آنے والا حیران و پریشان ہو جاتا ہے اور دشمنوں کا کبر و غرور اور بڑھ جاتا ہے۔
وہ تونگری، مسرت اور مال و دولت سے ہمکنار تھے۔ متکبر بن کر قیدیوں پر ظلم و ستم ڈھانے لگے تو فقیر بن گئے۔ (گویا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے)
اس کا راستہ ہچکولے کھانے والی کشتیوں کے ذریعہ ہے جو بھی ان پر سوار ہوتا ہے دردِ سر یا متلی میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔
اس کی جوش مارتی ہوئی موجیں کپڑوں اور بستروں کو تر کرتی ہیں اور ان کی تری سے مسافر بھیگ جاتے ہیں۔
مجھے ظلماً اہل وطن سے اچانک دور کر دیا گیا مجھے کمزور و نحیف ذریت کو بھی چھوڑنا پڑا۔
ان کو زبردستی ان کے مکان سے نکال دیا گیا۔ ان کے لئے آرام و سکون کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔
وہ مسکین و فقیر بن گئے کیونکہ مکان، روزی اور کوئی چیز بھی ان کے لئے نہ رہی۔
میں نے انہیں حالتِ گرسنگی میں چھوڑا، نہ ان کے پاس مال و دولت ہے نہ مسکن و منفعت
ان سے اپنے بیگانے، بن کر علیٰحدہ ہو گئے اور برابر والوں نے ظلم و ستم اختیار کیا۔
میرے خاندان اور اقارب کو قید و بند نے دور کر دیا، اب یہاں پانی کے سوا کوئی دوست نہیں ہے۔
میرے بیٹوں سے میری خبریں ایسی ہی پوشیدہ ہیں جیسی ان کی مجھ سے۔
میں احباب و اعزہ کی دوری پر روتا ہوں اور وہ میری جدائی پر۔
ان کا مجھ پر رونا ایک حد تک ٹھیک بھی ہے کیونکہ مرنا اور ذلیل قید میں زندگی گذارنا دونوں برابر ہیں۔
مجھے وحشیوں میں بسا دیا گیا، اس قید خانہ (جزیرے) میں دو قسم کے وحشیوں، کوّوں اور اجنبیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔
یہاں کی آب و ہوا ناموافق اور وبائی ہے، نہ تو اس کے کھانے میں شکم سیری ہے نہ پانی میں سیرابی۔
پانی گرم ہے جس میں سیرابی نہیں جس طرح کہ غذا ماش ہے جس میں مزا نہیں۔
اس میں نہ شیریں پانی ہے نہ لذیذ کھانا، اور نہ وسیع میدان ہی سامنے ہے
میری مصیبت میں میرے بدن کے عارضوں، قولنج، فتق (فوطوں میں پانی اترنا) اور

قوباء (داد) نے اضافہ کر دیا۔

میرا غم والم مٹنے والی عافیت پر ہے اور اس میں مصائب نے مجھے بھی مٹانے میں کسر نہیں رکھی اور اس کی ہوا ٹیڑھی ہے۔

فضل حق کے لئے رفعت و بلندی کا فضل تھا، اسی کی وجہ سے مجھے برابر والوں پر سر بلندی حاصل تھی۔

شرفاء میں قدر و منزلت و وجاہت میسر تھی جن کے سامنے رؤساء و اعیان ملک جھکتے تھے۔

کمال، رفعت، وسعت، نزہت، بزرگی، برتری تونگری، خوش بختی، نصیبہ وری، یہ سب نعمتیں حاصل تھیں جنہیں آزمائش و مصیبت بھی بوسیدہ نہ کر سکی ہے۔

پوری عافیت، بڑھتے ہوئے سامان کی بنا پر بڑھتی ہوئی آبرو اور پائیدار عزت بھی نصیب تھی۔

بہت سی عیش کی زندگی متغیر اور کتنی نعمتیں زائل ہو گئیں۔ سختی اور بدحالی نازل ہو گئی۔

اللہ نے مجھے وہ علوم عطا کئے کہ ان میں سے بہت کچھ علماء نے حاصل کئے۔

میرے اور میرے احباب کے درمیان جدائی حائل ہو گئی، حالت اور نعمت متغیر ہو گئی۔

شرارتیں گھر آئیں اور فتنے اچانک چھا گئے۔ مسرت جاتی رہی اور شادمانی و راحت پھر گئی۔

نصرانی ہمارے شہروں پر مسلط کر دیئے گئے، بیوقوف ہندوستانی ان کے مددگار بن گئے، وہ اسے نہ سمجھ سکے کہ نہ ان کے پاس وفاداری ہے نہ وسعت و حمایت۔

اس سے قبل ان پر ایسا شخص حکمراں تھا جسے غناء و سرود اور مال و دولت نے خدمتِ اہل دیار سے دور کر دیا تھا۔

اب جبکہ نصاریٰ کی پورے طور پر مدد کی گئی تو وہ ظلم و ستم میں افراط سے کام لینے لگے، اور کمزوروں کو تو جور و جفا نے جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا۔

وہ دیار جو آباد تھا ویران ہو گیا جس طرح کہ امراء و رؤسا تباہ و برباد ہو گئے۔

وہ قوم سبا کی طرح متفرق و منتشر ہو گئے، ان کے بہت سے گروہوں کو قید و بند نے آدبایا، مالدار فقیر، عزیز و شریف ذلیل، عظیم و کریم خوار، اور بڑے چھوٹے، بن گئے۔

ان کو پکڑ لیا ان کو قتل و ہلاک کیا حالانکہ جو جرم ان پر لگائے گئے تھے ان سے وہ بری تھی۔

انہوں نے اپنی بری اور بے گناہ رعایا کو بری طرح ہلاک کیا، خون ایسا بہا جیسے چشمے ابل

کر بیٹھے ہیں۔

بہت سے شہروں کو برباد وخراب کر کے ان کا نشان تک نہ چھوڑا، وہ جنگل اور میدان معلوم ہونے لگے۔

مسجدوں اور محلوں کو منہدم کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس جگہ کوئی عمارت ہی نہ تھی نہ وہاں کبھی کچھ تھا۔

ان کی نحوست وذلّت کی وجہ سے زمین کی پیداوار میں بھی کمی ہوگئی، اس میں کوئی نشو ونما باقی نہ رہی۔

انہوں نے لوگوں پر زندگی تنگ کردی، ان کے لئے رات اور دن کا کھانا بھی نہ رہا۔

ان کے سینوں میں بھرے ہوئے کینوں کے بوجھ سے ان کی پیٹھیں ثقیل ہوگئیں۔

کیا حد سے متجاوز سرکشی کی بھی کوئی حد ہے؟ اور کیا سرکشوں کی کوئی سزا بھی ہے؟

میں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ ان سے کسی قسم کی محبت ودلچسپی نہیں رکھی، اور بات یہ ہے کہ نص محکمِ قرآنی سے ان کی محبت کفر ہے، حق پرست انسان کو اس میں شک نہیں ہوسکتا۔

ان سے محبت روا کیسے رکھی جاسکتی ہے جبکہ آسمان وزمین جس کی وجہ سے پیدا کئے گئے اس ذاتِ گرامی کے یہ نصاریٰ دشمن ہیں۔

وہ پہلا نور ہے جو دنیا میں چمکا اور اس کی روشنی سے سارا عالم منور ہوا۔

وہی اول وآخر پیغمبر ہیں، انہیں پر نبوت ختم ہوئی اور انہیں سے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔

وہ بہترین سردار ہیں خدا نے اپنا بھید انہیں کے ذریعہ ظاہر کیا اور انہیں کی وجہ سے آفرینش وہلاکت ہے۔

اس نے انہیں ایسے بلند اوصاف کے ساتھ مختص کیا جو کسی جدید وقدیم کو نہ بخشے گئے۔

انہیں ایسا فضل وعلوِ مرتبہ عطا کیا کہ اس میں کوئی بھی ان کا شریک وسہیم نہیں۔

ان کے اچھے اچھے نام رکھ کر رفیع الشان بنایا۔ خالق کے ناموں میں سے ان کے بھی بہت سے نام ہیں۔

نیکوکار، رحمدل، کثیر الفضل، صاحب قوت، ہادی، نرم خو، محسن، کثیر العطا ان کے اوصاف و نام ہیں۔

ان کی پیدائش نے مکہ کی شان دوبالا کردی، اور بطحا نے ان کے وجود سے شرف پایا۔

ان کے قیام سے طیبہ (مدینہ منورہ) پاک و بلند رتبہ ہوا، دور دور سے لوگ اس کی زیارت کا قصد کر کے آتے ہیں۔

وہ خوشخبری سنانے والے انسان ہیں، ان سے پہلے صحف آسمانی اور انبیاء کرام ان کی بشارت دیتے رہے ہیں۔

ان کی بعث کی عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے قبل موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی جیسی کہ شعیاء (بن امصیا) نے عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔

شہزادیاں ان کے دربار میں لونڈیاں بن کر حاضر ہوئیں، اسی طرح صحیفۂ آسمان کی پیشین گوئی تھی۔

چمکنے اور چمکانے والے چاند کو انہوں نے اشارہ سے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو جدا جدا کر دیا تھا۔

سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ ادائے نماز کے لئے ٹھہر گیا۔

پتھروں اور درختوں نے انہیں سلام کیا اور بہت سے چوپائے ان سے فصاحت کے ساتھ ہم کلام ہوئے۔

کنوؤں سے پانی جاری کر کے انہوں نے پیاسوں کو سیراب و شاداب کیا۔

اس کی برکت سے بہت بھوکوں کا تھوڑی سی غذا نے پیٹ بھر دیا، اور بہت نادار، مالدار بن گئے

جدائی پر کھجور کا تنا اس عاشق کی طرح رویا جس کو محبوب سے دوری کی سوز و تپش رلاتی ہے۔

امین و معتمد ہیں، امّی ہو کر ایسی حکمت کی تعلیم دیتے ہیں جس کے سمجھنے سے حکماء و عقلا بھی عاجز ہیں۔

حاکم ہیں، ذکرِ حکیم کو تلاوت کرتے ہیں، اس کی آیتیں محکم ہیں، ان میں ہدایت و شفا ہے۔

ذکر حکمتوں اور حکموں پر مشتمل ہے جن سے عقلیں دنگ اور اہل عقل و دانش عاجز ہیں۔

اس ذکر حکیم کی بلاغت کمال کو پہنچی ہوئی ہے، اس نے بلیغوں کو ساکت اور فصیحوں کو گونگا بنا دیا ہے۔

اس نے اپنی سہل و روشن شریعت کے ذریعہ منسوخ شریعتوں کی سیاہی کو دور کر دیا۔

ان کی ملت کے ظہور نے تمام ملتوں کو اس طرح مٹا دیا جیسے تارے سورج کے چمکتے ہی محو ہو جاتے ہیں۔

سورج کی روشنی ستاروں کی چمک مٹا دیتی ہے اور سمندر، دریاؤں پر غالب آ جاتا ہے۔
اللہ نے ان کے دین کو غالب و باقی رکھا اور مرورِ دہور پر اسی کو بقا ہے۔
اگر بیوقوف اور معاند دشمن ان کے ان کمالات کا انکار کرتے ہیں تو تعجب کی بات نہیں۔
قرصِ خورشید کو اندھے کی آنکھ کی بے نوری ضرر نہیں پہنچا سکتی۔
اذان میں ان کے نام کو بلند آواز کے ساتھ پکارنا، اللہ نے ضروری قرار دیا۔
اگر آدمؑ کے مراتب اس فرزند سعید کی بدولت بلند ہو گئے تو تعجب کیوں ہے، بہت سے باپ بیٹوں کی وجہ سے بلند مرتبہ ہوئے ہیں۔
بہت سے رسولوں نے امت وسط ہونا چاہا ان میں سے بعض کی آرزو پوری کر دی گئی (جیسے کہ زمانۂ امام مہدیؑ میں عیسیٰ علیہ السلام یہ شرف حاصل کریں گے)۔
میدان حشر میں لوگوں کی سراسیمگی کے وقت وہ جائے پناہ ہیں، ان کے سوا اور کسی سے امید نہیں ہو سکتی۔
سب حضرت آدم اور دوسرے رُسل علیہم السلام کے پاس طلبگارِ شفاعت ہو کر پہنچیں گے مگر وہ سب خاموشی اختیار کر لیں گے۔
سب سے مایوس ہو کر وہ سب، ان سخی داتا کی خدمت میں حاضر ہوں گے، یہ فلاح و نجات والی سخاوت سے کام لیں گے۔
انہوں نے مخلوق کے لئے خالق کی وہ خوشنودی چاہی، جو اس کے برگزیدہ بندے کی رضا تھی۔
اور ان کی رضا اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایمان والوں کو عذاب سے نجات ملے
ان کی اولاد شریف، بزرگ اور سردار ہے۔ مخلوق پر انہیں رفعت و بلندی حاصل ہے اور ان کی چمک دمک کے سامنے سب ماند ہیں۔
وہ عظیم و کریم اور نجیب و نقیب ہیں۔
ان کے اوصاف و مناقب کا احاطہ کسی مدح کرنے والے کی مبالغہ آمیز مدح بھی نہیں کر سکتی۔
ان بزرگوں کی فیروز بختی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے جبکہ ان کے جدِّ امجد افضل خلق خدا ہیں اور وہ سب ان کے اجزاء ہیں۔
ان کے صحابہ بڑے بہادر، آپس میں رحیم اور دشمن پر شدید ہیں۔
اللہ نے قرآن کی آیت میں ان کا وصف بیان کیا ہے۔ یہ وصف ایسا ہے کہ اس سے بڑھ کر انسانوں کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

انہیں ''السابقون الاولون'' سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ طبقہ صحابہ میں سب سے بہتر ہے اور
ان میں بھی سب سے اعلیٰ خلفاء راشدین ہیں۔

اے رحمتِ عالم! اس شخص پر رحم کیجئے جس کے لئے زمانے میں کہیں رحم نہیں۔

میں آپ پر قربان! اس قیدی پر احسان فرمائیے جس پر نہ کوئی رحم کرنے والا ہے اور نہ اس
کے پاس فدیہ و احسان ہے۔

ناامیدی اور تاخیر کے بغیر اس کی شفاعت فرمائیے کیونکہ زمین اور اس کے وسیع و عریض
اطراف واکناف اس کے لئے تنگ ہو چکے ہیں۔

اے شاکی اونٹ کے فریاد رس! مجھ پر بھی ویسی ہی مہربانی فرمائیے، مجھے بھی بیماری اور
مجبوری کی شکایت ہے۔

مصائب کی رسی زمانہ دراز سے دراز ہے۔ ان کو دور فرمائیے اور سفارش کیجئے تا کہ اس
اذیت سے نجات ملے۔

آپ کی سخاوت و عطا کے سوا، رب رحیم و معطی کے سامنے مجھے کوئی امید نہیں۔

مجھے نفع پہنچائیے اور خدا کی بارگاہ میں سفارش فرمائیے، میری مصیبتوں پر رحم فرمائیے
کیونکہ آپ مستجاب الدعوات ہیں۔

اے خدا! میری امیدوں کو ثابت کر دکھا اور دشمنوں سے مجھے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما
میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا۔
میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا۔ یہ میں نے بڑا جرم کیا، جب نیک بخت
حضرات نے مجھے شہادت کے لئے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا یا میں شہادت سے محروم رہا جبکہ سعادت
مندوں نے جام شہادت نوش کیا۔

اے آمرزگار! میرے قصور کو معاف کر، اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی اس سے درگذر،
تجھی سے عفو و درگذر کی امید ہے[1]۔

[1]- مولانا نے جن لوگوں کی تعریف کی ہے وہ سید احمد شہید کی تحریک کے مجاہدین اور جنرل بخت کی سرداری میں داد
شجاعت دینے والے روہیلے تھے۔
ان سطور سے دو باتیں ظاہر ہیں۔
(الف) وہ جنگ آزادی میں عملاً شریک نہیں تھے اس لئے نادم و شرمسار تھے اور
(ب) مجاہدین کی قربانیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اگر میرے جرموں کی فرد بڑی ہے تو تیرے پاس ایسی وسیع رحمت ہے جس کی حد و نہایت نہیں۔

مغفرت و عفو فرما، توبہ قبول کرتے ہوئے دشمنوں اور چغلخوروں کے ابتلا سے مجھے نجات دے۔

میری مصیبتیں اگر میرے حق میں مقدر بھی ہو چکی ہوں تب بھی مظلوم کی دعا سے ردِ قضا ہو جایا کرتا ہے۔

مجھے بدبختی میں نہ ڈال، نیک بخت بنا، پھر سعادت کے بعد شقاوت کی نوبت نہ آئے۔

جو مظلوم تجھے پکار رہا ہے اس کی سن لے اور اس کی مصیبت دور کر۔ کافروں نے ظلم و تعدی کا اس کے ساتھ برابر تاؤ کیا ہے۔

ان کی طرف سے مصائب، اتہامات اور رسوائیوں کے پے بہ پے حملوں نے مجھے ضعیف و ناتواں بنا دیا ہے۔

تو میرا وکیل ہے میرے معاملہ کو ایسے دشمنوں کے سپرد نہ کر جن کی ایذا رسانی نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔

اے خدا! ان سے انتقام لے اور انہیں رسوا کر تا کہ ان کی سزا سے میرے مصائب کی کچھ تلافی ہو سکے۔

اے پروردگار! میرے دشمنوں سے انتقام لے اور مجھے پناہ دے، میری مدد کر، مدد و پناہ تیرے ہی پاس ہے۔

کامیابی کا مجھے مدت سے انتظار ہے، اب میری امیدِ نجات میں تاخیر ہونی چاہئے۔

اے پروردگار! عجلت فرما تا کہ جلاوطنی کی تکلیفوں سے رہائی و خلاصی نصیب ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا بلکہ بداعمالی ہی میں مبتلا رہا۔

میری عمر لہو و لعب میں بیکار گذری اور خواہشات نے مجھے نیکیوں سے غافل رکھا۔

کوئی ثواب کا کام نہ کر سکا، میرے قول و فعل میں ریاء و نمائش کو دخل رہا۔

لیکن تیرا فضل و کرم وسیع ہے، اسی سے اپنی بیماری اور گناہوں سے برأت کی امید ہے۔

مجھ پر رحم فرما، مجھے ایسی آزمائش سے سابقہ پڑا ہے کہ اس سے زیرکی اور اصابت رائے بھی نہ بچا سکی۔

ساٹھ سال تک تو نے مجھے امن و عافیت میں رکھا، تیرے فضل سے اس مدت میں نعمتیں

بڑھتی ہی رہیں۔

پھر اچانک میری عافیت مختل اور احتیاج مسلط ہوگئی۔ رحم فرما، خیر وعطا تیری ہی جانب سے مل سکتی ہے۔

اے میرے رب! تیرے دربار میں میرے وسیلے حضرت محمد ﷺ، علی، حسن، حسین اور فاطمہ زہرا ہیں۔

اے پروردگار! جب تک سرسبز وشاداب مرغزاروں میں کبوتروں اور سبز رنگ پرندوں کی آوازیں گونجتی رہیں، سرکار پر رحمت نازل فرما۔

اور جب تک بارش اور مسلسل جھڑیاں زمین کو سیراب کرتی رہیں، اللہ کی برکتیں اور اس کی رحمتیں ان سب بزرگوں پر نازل ہوتی رہیں۔

☆☆☆

قصیدہ دالیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے محبوبہ[1]! واپس آ اور ایک ایسے مریض کی عیادت کر جس کا مرض قدیم اور متعدی ہے اور جو ہلاکت کے اس درجہ قریب پہنچ چکا ہے کہ دشمن بھی عیادت کو آنے لگے ہیں۔

وہ امراض کا عادی بن چکا ہے، اس کے عیادت کرنے والے اس سے تنگ آ کر کنارہ کش ہو چکے ہیں، حالانکہ ستار اور بانسری بجانے والے اس کے گرد رہا کرتے تھے۔

وہ مرض ہلاکت کا خوگر ہو گیا ہے، چارہ ساز و غمخوار بھی تھک چکے ہیں، وہ عیادت گروں اور اہل و عیال پر بار گراں بن گیا ہے۔

وہ ایسا مریض ہے جس کی بیماری ایسا عجز و درماندگی ہے جس کی کوئی دوا نہیں، اسکے ظاہر مرض کی وجہ سے موت ہر وقت سامنے ہے۔

زمانہ کی حالت پر حسرت وافسوس ہے کہ مریض مزمن کو شفایاب ہونے نہیں دیتا، اس کا علاج غم کی زیادتی کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

مری بیماری سخت ہے، عیادت گروں کی بار بار چارہ فرمائی بھی ایسے مریض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی جو امراض کے ہجوم و درود کا عادی ہے۔

میرے سینے میں وہ غم واندوہ بھر گیا جس نے اندرونی و بیرونی اعضاء کو غضا[2] لکڑی کی آگ کی طرح جلا ڈالا جو جلاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے۔

بہت فرق ہے اس آگ میں جس کے جلنے کی جگہ تنور کا پیٹ ہو جس کا ایندھن لکڑیوں کا گٹھا ہوتا ہے۔

اور اس غم والم کی آگ میں جو ہماری اعضا کو جلاتی ہے، جس کا ایندھن ہماری آنتیں، پسلیاں اور قلب وجگر ہیں۔

کمبختی نے پشت دکھادی، اب نہ سلمیٰ ہی مصالحت کرتی ہے اور نہ سعاد ہی سعادتمندی کا اظہار کرتے ہوئے مدارات پر آمادہ ہے۔

۱- عربی شاعری میں ہم سفر ساتھیوں یا محبوبہ سے خطاب کیا جاتا ہے اور علی العموم قصائد کی ابتدا اسی تخاطب سے ہوتی ہے۔

۲- غضا ایک درخت ہے جس کی لکڑی سخت ہوتی ہے اس کی چنگاری بہت دیر تک نہیں بجھتی۔

اس کا غم اٹھاتے اٹھاتے بدصورت بن گیا، جو لوگ مجھے یوم پیدائش سے پہچانتے ہیں انہیں بھی شناخت میں تامل ہونے لگا۔

میری طاقت کم ہوگئی اور ضعف دونا ہوگیا، یہ سب کچھ، قویٰ اور جسم میں بہت زیادہ نقص کی وجہ سے ہوا۔

میرے قلب، روح، جسم اور بدن کو جو مصیبتیں پہنچیں ان کی وجہ سے مجھ میں قوت باقی نہیں رہی۔

سخت مصیبت کی وجہ سے ہلاکت کو پہنچ گیا، روحانی اور جسمانی اذیتوں میں گھر کر شیخ فانی بن گیا۔

اچانک مصیبت نے آدبایا، اس نے میرے اہلِ خاندان اور رشتہ داروں کو رلایا اور دشمن وحاسد کو ہنسایا۔

اس مصیبت نے مجھے کمزور وناتواں بنادیا اور شریر و بدخصلت لوگوں کے مکر نے مجھ سے زیرکی ودانائی کو زائل کردیا۔

رعایا، فوج اور لشکر کے گروہوں کے لئے امن کا اعلان کر کے ان نصاریٰ کی ملکہ نے بھی مکر سے کام لیا۔

اس نے پہلے تو مسلمانوں اور بت پرستوں کی جماعتوں کو نصرانی بنانے کا قصد کیا۔

سب نے اعراض کرتے ہوئے صاف انکار کردیا اور اسے برا سمجھتے ہوئے دوری اختیار کرلی، البتہ تھوڑے ذلیل اور رذیل اشخاص نے اس کا کہنا مان لیا۔

اس نے اس کی سفید فوج پر حملہ کیا اور گردشِ تقدیر سے شکست کھا گئے، جیسے بکریاں بھیڑیے اور شیر سے دور بھاگتی ہیں یہی ان کا بھی حال ہوا۔

پھر اس نے ہندوؤں میں سے جاٹ، ٹھاکروں کو اپنی مدد کے لئے جمع کیا۔

اور بعض مدعیانِ اسلام کو بھی۔ وہ دھوکے میں آکر مدد کے لئے آمادہ ہوگئے۔

انہوں نے اپنے ساتھیوں پر حملہ کر کے زیادتی سے کام لیا اور اپنے مقابل لوگوں سے پوری طرح تیاری سے پیش آکر بڑا ظلم کیا۔

ان سب نے دشمن کی مدد کے لئے بہت سا سامان جنگ اور بے شمار لشکر اکٹھا کیا۔

پھر اس ملکہ نے پہاڑیوں سے مدد لی، انہوں نے پوری رغبت اور بہادری سے مدد کی۔

اس نے محاربوں اور دشمنوں کی امان کے اشتہارات جاری کئے کہ بچوں، عورتوں اور

قیدیوں کے قاتلوں کے سواسب کو امان ہے۔
جنہوں نے صلح کی، آلاتِ حرب اس ملکہ کے عاملوں کے سپرد کردیئے اور فرمانبرداروں کی طرح اطاعت گذار بن گئے۔
اس نے تمام دہقانیوں کو لالچ دیا جس کی وجہ سے اکثر دیہاتی اور بادیہ نشین اس کے مطیع ہو گئے۔
ان سب کی مدد نے ان کو مسلط و غالب کردیا جبکہ ہر پستی و بلندی پر ان کی مدد کی۔
انہوں نے شہروں پر غارتگری کے ذریعہ قبضہ کرلیا اور ان کے آثار ونشانات بھی باقی نہ چھوڑے۔
وہ بلند اور پست مقامات پر پہنچے اور قتل، لوٹ مار اور سارے علاقہ میں فتنہ وفساد پیدا کردیا۔
عبادت گاہوں کو منہدم اور مسجدوں کو مسمار کردیا، خدا کے بندوں کو قتل کیا اور عابدوں کی ہلاکت میں حد سے گزر گئے۔
جن لوگوں نے اس ملکہ کی اطاعت نہیں کی تھی، ان پر ایسی بزدلی چھائی تھی کہ نہ اپنے سردار کا حکم مانتے تھے اور نہ حاکم کی بات سنتے تھے۔
اس میں سے ایک فریق کو فقر و فاقہ نے جنگ سے تھکا دیا تھا اور دوسرے گروہ کو بزدلی نے پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔
اب ملکہ نے دیکھا کہ کوئی جنگ کا خواستگار دشمن، باغی اور سرکش باقی نہیں رہا۔
وہ اپنے قول سے پھر گئی اور دشمنی پر اتر آئی، کوئی اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور عہد و میثاق کی رسیوں کو کاٹ دیا۔
اس نے وعدہ کر کے لوگوں کو آرزومند بنادیا پھر عداوت و ظلم سے کام لیا، دراصل اس کا وعدہ، وعید کے لئے مکر تھا۔
اس کافرہ کے جھوٹے وعدوں اور قسموں سے دھوکے میں پڑ کر میں بھی اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ آیا۔
ہمارے ساتھیوں میں دوسرے روپوش لوگ بھی واپس آ گئے مگر نصاریٰ نے صرف مجھی کو قید میں ڈالا۔
وہ مجھے قید خانے کھینچ کر لے گئے اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے درماندہ و شکستہ دل قیدیوں میں شامل کردیا۔

وہ بڑے جفاکش قیدی تھے، قید خانہ کے دربانوں اور نگہبانوں کی بے انتہا سختی اور ان کے مزاج کی تیزی کو برداشت کرتے تھے۔

بدخو اور درشت مزاج نگہبانوں کی محنت و مشقت نے ان کے بدن پر کھال نہ چھوڑی تھی اور جلّاد کے کوڑوں نے بدن کی کھال پھاڑ دی تھی۔

دشمنوں کی جماعت نے دشمنوں کو اور مجھے جمع کر دیا اور میرے اعضا اور بازوؤں کو جدا کر دیا۔

جن لوگوں سے مجھے امیدیں تھیں وہ اعراض کر گئے اور میرے دوستوں اور ساتھیوں کو مجھ سے علیٰحدہ رکھا گیا۔

میرے اور اعزہ کے درمیان جدائی حائل ہوگئی اور اولاد و احفاد کے فراق نے مجھے غم میں ڈال دیا۔

میں غمگین و حزین جیل میں پہنچا دیا گیا، میرے پاس میرا کوئی رفیق، باورچی یا خدمتگار بھی نہ چھوڑا گیا۔

میرا عمدہ لباس اتار کر قیدیوں کے کپڑے پہنا دیے، میرا توشہ اور کپڑے چھین لئے۔

انہوں نے سخت، موٹا اور چبھنے والا بستر، ایسے راحت پسند شخص کو سونے کے لئے دیا جو نرم بستر کا عادی تھا۔

میں نے پیاس کی شدت کی شکایت کی تو گرم اور کھاری پانی پلایا، اور ایسی غذائیں مہیا کیں جن کا میں کبھی عادی نہ تھا۔

میرے قید کرنے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اس کے ساتھ جلاوطنی، مسافرت اور اہل وطن سے دوری کا بھی اضافہ کر دیا۔

اور دوسرے قیدیوں کو جہاز پر سوار کر کے لے چلے، اور وہ جہاز سمندر کی موجوں سے ہچکولے کھاتا چلتا تھا۔

اور مجھے ان قیدیوں کے ساتھ ایک دور دراز پہاڑی پر اتار دیا جہاں قصد کرنے والوں کا وہم و گمان بھی نہ پہنچتا تھا۔

ہمارے قید کرنے والے نے ہم پر ظلم روا رکھ کر ہماری دید سے لوگوں کو محروم کر دیا اور ہمارے درمیان ایسے سمندر کا کنارہ حائل ہو گیا جس میں پانی کے جوش سے جھاگ پیدا ہوتے ہیں۔

وہاں کی ہوائیں اپنی خرابی کی وجہ سے جان نکال لیتی تھیں۔ وہ اس ہلاکت خیز آندھی کی

طرح تھیں جو قوم عاد پر اس سے قبل بھیجی جا چکی تھی۔
اس میں آرزوئیں پامال اور موت عام تھی اور کسی میت کے لئے دفن و قبر کا کوئی انتظام نہ تھا۔
غموں کے بادل قسم قسم کے رنج والم برساتے رہتے ہیں اور وہ بادل صبح، شام اور شب کو آتے جاتے رہتے ہیں۔
وہاں کبھی دن میں سورج کی روشنی نظر آتی ہے نہ چمکنے والے چاند اور تاروں کی رات میں چمک۔
میرا دن، رات کی طرح ہے، اور میری رات کو دوام ہے، آسمان پر ستارے ایسے رکے ہوئے ہیں جیسے میخوں میں انہیں باندھ دیا گیا ہو۔
ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری تاریک راتیں، روشن دن کی طرح تھیں اور ہمارے دن عید کے دن تھے۔
میری رہائی کے لئے کیا حیلہ ہوسکتا ہے، جو زمیں میرا بار اٹھائے ہوئے ہے اس کے سارے راستے مسدود ہیں۔
مجھے چھٹکارا کیسے نصیب ہوسکتا ہے، میرا دشمن، ظالم و بدخو ہے، اس کافر کی خرابی ہو جو خدا کا بھی منکر ہے۔
مجھے تکلیف پہنچانے کیلئے نصاریٰ نے ایسے زندیقوں کو آمادہ کیا جو ان کے مقرب ہیں اور وہ بھی جن سے ان کے الحاد کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔
وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جدوجہد سے کام لیا، پوری پوری دشمنی برتی اور بغض و کینہ کا کھلا مظاہرہ کیا۔
اپنی تدبیروں کے انقطاع پر میں ناامید و مایوس ہو گیا اور شکاری کے جال میں پھنسے ہوئے پرندہ کی طرح حیران و پریشان میری حالت اس ہرن سے مشابہ تھی جو شکاری کی لکڑی سے موقع شکار کے خوف سے مصالحت کر بیٹھا ہو۔
میں نے چند لوگوں سے ان قحط زدہ اشخاص کی سی امید باندھی جو ایسے بادلوں سے جو گرج اور چمک کر چھٹ گئے ہوں امیدیں باندھ لیتے ہیں۔
میں نے خدا کے سوا سب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اس کے سوا کسی دوسرے سے بخشش و امداد کی امید نہیں ہے۔

اس بادشاہ عادل کی رحمت کا ہی میں امیدوار ہوں جس کا ذکر میرا حرزِ جان اور میرا ورد ہے۔

وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا، حیا رکھنے والا اور پکارنے والوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے والا ہے۔ ہلاکت زدہ اور مظلوم و مضطر کی دعا رد نہیں کرتا ہے۔

وہ کمزور قیدیوں کو ایسے جابر، متکبر اور سخت انسانوں سے نجات دلاتا ہے جو وادی میں پتھروں کو کاٹنے والے ہیں۔

فرعون و شداد جیسے سخت و جابر بادشاہوں پر کمزور عاجزوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

اس مصیبت زدہ کے لئے جس کا کوئی حیلہ وسیلہ نہ ہو اور جس کی رہائی کیلئے نہ کوئی فدیہ ہو اور نہ احسان، خدا کے سوا کون چارہ ساز ہے۔

اے پروردگار! اس عاجز و خستہ کو، ستودہ صفات، احمد و حماد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل میں، کافر دشمنوں کے چنگل سے نکال۔

تو نے انہیں تمام مخلوق کی طرف، اس کی رہبری و ہدایات اور عطا و امانت کے لئے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے۔

وہ مصیبت و عذاب روکنے کے لئے پکارنے والوں کے فریاد رس، روزِ قیامت میں ہماری پناہ گاہ، اور مجلس میں بڑے سخی و جواد ہیں۔

وہ گمراہ کے لئے ہادی، نابینا کے حامی، فریادی کے مددگار، سفارش چاہنے والے کے شفیع اور سائل کو عطیات سے نوازنے والے ہیں۔

ظلم سے شاکی پڑوسی کے محافظ ہیں، امداد چاہنے والے کے معاون اور طالبِ عطا کے لئے سخی ہیں۔

وہ خوشخبری سنانے والے ہادی ہیں۔ راہبوں نے ان کی آمد کی اطلاع حالتِ خوف میں پہنچائی اور اسی طرح یہود نے۔

انہوں نے ہر گم کردہ راہ کو سیدھا راستہ بتایا اور ہر ٹیڑھے کو سیدھا کر دیا۔

وہ غمگین کے فریادرس اور طالب بارش کے لئے بادل، گھاٹ پر آنے والوں کے لئے دریا، چارہ اور پانی کے متلاشی کے لئے (سرسبز) میدان ہیں۔

وہ دریا ہیں، ان کی شریعت روشن اور صاف ہے، جس کے احکام پیاسوں کے لئے شیریں چشمہ ہیں۔

وہ بڑے نیک اور سخی ہیں بھوکوں کا ان کی انگلیاں پیٹ بھرتی ہیں، جب انگلیاں سخاوت

پر آتی ہیں تو تشنہ لبوں کی پیاس پر غالب آ جاتی ہیں۔

آدم علیہ السلام کی بزرگی میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا تو تعجب کیوں ہے، بہت سے آباء واجداد نے اپنی اولاد کے مجد و شرف کے باعث بلند مرتبہ پالیا ہے۔

وہ خاتم النبیین ہیں، نبیوں میں سب سے اول و افضل ہیں، مخلوق میں اولیت کا شرف انہیں کو حاصل، اور انہیں کی روشنی سب سے پہلی ایجاد ہے۔

ان کا دین تمام دینوں کا ناسخ اور رہتی دنیا تک رہنے والا ہے۔

انہوں نے حکمت والی، مضبوط اور فیصلہ کن کتاب کی تلاوت کی، وہ کتاب متلاشی حق کے حق میں اور شکی کے خلاف فیصلہ صادر کرتی ہے۔

رسولوں نے ان کے امتی بننے کی خدا کے بارگاہ میں دعا کی روایات میں اسناد کے ساتھ اس کا تذکرہ موجود ہے۔

انہوں نے امت وسط، شاہد عادل (امت محمدیہ) میں شمار ہونے کی دعا کی جو کہ تمام سابقہ امتوں پر قیامت کے دن گواہ بنے گی۔

ان میں سے بہت کی آرزو پوری نہ ہوئی، اور بعض اپنی مراد کو پہنچے۔

کس قدر قابل عظمت ہے۔ ان کی شریف، بزرگ، نجیب اور بلند رتبہ اولاد۔

ان کے صحابہ نے دین کے لئے جہاد کیا، معاونت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس سلسلہ میں طرح طرح کی کوششیں کیں۔

اے مخلوق کے سردار، اور اخلاق میں سب سے بلند و بہتر، امیدوں کے بہترین سہارے اور تمام اہل سخاوت سے بلند مرتبہ رکھنے والے!

میں آپ پر قربان! مجھ پر رحم فرمائے اور مجھے بخشش سے نوازیئے، اپنی عطا سے میری مشقتوں اور غموں کی تلافی کیجئے، اے جود و عطا کے مالک!

مجھ پر کرم کرتے ہوئے خدا سے میری سفارش کیجئے کہ مجھے جلاوطنی اور قید تنہائی کی مصیبت و آزمائش سے نجات دے۔

اور جلد سے جلد میری ان پریشانیوں اور اذیتوں کو دور کرے جو حد و شمار سے متجاوز ہو چکی ہیں۔

اور مجھے عجلت کے ساتھ اپنی عافیت میں لے اور میرے غم کو سرور اور شقاوت کو سعادت سے بدل دے

اے میرے محافظ ورہنما! اس بات کی بھی دعا کیجئے کہ خدا میری موت آپ کی اقامت گاہ کے جوار میں شہادت کی موت مقدر کر دے۔

میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں، اپنے کرم سے میری مدح وستائش قبول فرمایئے تاکہ اشعار خوانی کی بدولت میں اپنی مراد کو پہنچوں،

آپ پر اللہ کی پاکیزہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں، جب تک سرسبز وشاداب مرغزاروں میں قمریوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور گانے والے گاتے رہیں۔

مصنف علیہ الرحمہ نے آخر میں تحریر فرمایا:

یہ دونوں قصیدے رجب ۱۲۷۶ھ میں بحالتِ اسیریٔ جزیرہ وبائی تمام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وسیعہ اور قدرت بدیعہ سے اپنے حبیب اور اس کی آل اطہار اور اولاد امجاد کے طفیل اس وبائی جزیرہ سے نجات دے، ان سب پر اللہ کی روشن نعمتیں اور پاکیزہ رحمتیں نازل ہوں۔

☆☆☆

غالبؔ اور ہماری تحریکِ آزادی

۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کو حاصل ہونے والی جنگِ آزادی کوئی اتفاقی واقعہ یا انگریزوں کی فراخدلانہ عطا نہیں تھی بلکہ ہندوستانی عوام کی برسہا برس کی قربانیوں، عوامی بیداری کی تحریکوں اور خفیہ انقلابی تنظیموں کی بے مثل کارگذاریوں کا منطقی نتیجہ تھی۔

اس کی جڑیں ۱۸۵۷ء کی مسلح مزاحمت میں پیوست ہیں جن کو برطانوی، ہندوستانی مورخین میں سے اکثر نے غدر، شورش، بغاوت اور چند ایک نے جنگِ آزادی کہا ہے[1]

لیکن اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں میں شعوری یا لاشعوری طور پر یہ حقیقت تقریباً سبھی نے تسلیم کی ہے کہ ہندوستانی عوام کے ہی نہیں، انگریزوں اور عالمی برادری کے دیگر ملکوں کے باشعور عوام کے ضمیر پر بھی جو پہلی ضرب پڑی وہ ۱۸۵۷ء ہی کے واقعات کے سبب پڑی۔[2]

۱۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کو بیشتر انگریز مورخین اور تذکرہ نگاروں نے 'غدر' یا 'بغاوت' کہا ہے مگر ایسے مورخین کی تعداد بھی کم نہیں ہے جنہوں نے مسلح مزاحمت کو جنگ آزادی سے تعبیر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں 'دی لندن ٹائمز' کے مشہور نامہ نگار سر ڈبلیو رسل کی کتاب My Diary in India in the year 1858-59 کے صفحہ ۱۶۴ سے اس اقتباس کو بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے کہ،

> ''یہاں نہ صرف غلاموں کی جنگ اور کسانوں کی بغاوت یکجا ہوگئی، بلکہ اجنبی حکومت کا جوا اتار پھینکنے، ہندوستانی والیان ریاست کے کامل اقتدار کو بحال کرنے اور ملکی مذہب کا پورا غلبہ قائم کرنے کی غرض سے یہ ایک مذہب کی جنگ، نسل کی جنگ، انتقام کی جنگ، امید کی جنگ اور قومی عزم کی جنگ تھی۔''

۲۔ برطانیہ کا، رینالڈ نیوز پیپر، مزدور طبقے کے غیر سوشلسٹ نظریہ کا ترجمان تھا۔ اس نے ہندوستان کے ان فوجیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا جنہوں نے انگریزوں کے خلاف مسلح مزاحمت کی تھی۔ برطانوی شاعر ارنسٹ جونز کو بھی ایک عرصہ سے ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی خبر پا کر اس نے اپنی وہ نظم دوبارہ شائع کرائی جو ۱۸۵۱ء میں لکھی گئی تھی اور جس کا عنوان تھا ''ہندوستان یا نئی دنیا کی بغاوت'' مارکس نے ہندوستان کے حریت پسند فوجیوں کے، جنہیں انگریزوں نے باغی لکھا ہے، مظالم کو جائز ٹھہرایا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ باغی فوجی جو کر رہے تھے وہ انگریزوں ہی کے کرتوتوں کا پھل تھا۔ دیکھئے 'مارکس اور اینجلز برطانیہ پر' ص ۴۴۹

فرانس میں بھی اس جنگ کی حمایت میں آواز اٹھائی گئی تھی جو ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے خلاف شروع کی گئی تھی، یہاں کے ایک رسالہ Le siecle نے ۹؍ ستمبر ۱۸۵۷ء ہی کو لکھ دیا تھا کہ ہندوستان کی بغاوت اس وقت کا واحد اہم واقعہ ہے، ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں شروع کی گئی جنگ کی بازگشت اٹلی میں بھی سنی گئی تھی جو اس وقت ایک متحد اور آزاد قوم کی حیثیت سے (بقیہ حاشیہ صفحہ دیگر)

یہ صحیح ہے کہ اس جنگ کی ابتداء میں، شاید اس لئے کہ اس کا منصوبہ خفیہ طور پر بنایا گیا تھا اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والوں کے نام اور کام بھی صیغۂ راز میں رکھے گئے تھے، اس کی حیثیت ونوعیت کو نہیں سمجھا گیا اور عام طور سے لوگوں نے اس جنگ آزادی کو ''آسماں کی چشم بد'' ''فریب تقدیر'' اور ''قہر الٰہی'' سے تعبیر کیا لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی حیثیت قومی ہے اگرچہ اس کے اثرات ہر جگہ اور ہر طبقہ پر یکساں نہیں ہیں۔

خود انگریزوں کے ایک طبقہ نے تسلیم کیا ہے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے مسلح مزاحمت ہندوستانیوں کی قومی تحریک ہی کا ایک حصہ تھی۔ مثال کے طور پر لارڈ ایلین برا کا ۱۸۵۸ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں دیا گیا وہ بیان دوہرایا جا سکتا ہے جس میں اس نے اعتراف کیا کہ

''اگرچہ ہمارے مورخین یہ دعویٰ کرنے کے دلدادہ ہیں کہ غدر محض ایک فوجی بغاوت تھی لیکن ہزاروں فوجیوں کو مقدمے کا ڈھونگ رچا کر یا اس کے بغیر ہی پھانسی دینے اور سوائے ہندوستانی نسل کے آباد کئے ہوئے دوستوں کے، دشمنوں

(پچھلے صفحے کا حاشیہ)

بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا، اس کے باوجود یہاں کے اخباروں نے ہندوستان کے واقعات پر ردعمل کا اظہار کیا، یہاں کے ایک جمہوری اخبار 'اٹیلیا ڈیل پاپولو' نے ۸ر جولائی کو لکھا کہ بغاوت نے انگلستان کو ایسے ناکوں چنے چبوائے ہیں کہ اسے ہندوستان کے سوا کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں رہ گئی ہے۔

چین اور روس میں اس سے بھی شدید ردعمل ہوئے۔ ان کی تفصیل بیان کرنا یہاں ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔

۱۔ متعدد انگریز تذکرہ نگاروں، صحافیوں اور حاکموں کی تحریروں کا اقتباس پیش کرنے کے بعد جنھوں نے ۱۸۵۷ء یا اس کے بعد کے برسوں میں تسلیم کر لیا تھا کہ ہندوستان میں مسلح مزاحمت اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مکمل جنگ تھی، پی سی جوشی نے اپنے مضمون ''ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء'' میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے۔

''پس ۱۸۵۷ء کی عظیم قومی بغاوت نے اگلے دور کی ہندوستانی جدوجہد آزادی کے ساتھ عالمگیر جمہوری یکجہتی کی بنیاد ڈالی اور ہماری نئی قومی تحریک خود صحیح بین الاقوامی روایات پر قائم ہوئی۔ مثال کے طور پر ہندوستانی قومی تحریک نے ۲۹-۱۹۲۰ء کے دوران مشرق وسطیٰ میں شہنشاہیت پرستانہ پالیسیوں کی پرزور مخالفت کی اور زاغلول پاشا کے تحت مصریوں کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا ثبوت دیا۔ ۳۹-۱۹۳۰ء کے دوران اس نے جاپانی حملہ آوروں کے خلاف چینیوں کی جدوجہد اور تاناشاہی کے خلاف عالمگیر تحریک کے ساتھ عملی یکجہتی کا اظہار کیا۔ اس لئے یہ محض اتفاق نہ تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان دنیا کی ایک بڑی طاقت بن کر نمودار ہوا اور امن عالم اور تمام محکوم قوموں کی آزادی کا علمبردار بنا۔'' (انقلاب ۱۸۵۷ء ص ۹-۲۱۸)

کے دیہات کو جلا دینے کے عمل نے غدر کو ایک عوامی بغاوت میں بدل دیا تھا۔"[1]

بعض دوسرے انگریزوں نے عوامی بغاوت کے نظریہ کو قبول کرنے میں کسی حد تک تامل کیا ہے۔اس کے باوجود یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہ عوامی بغاوت ایک خاص سطح، علاقہ اور عوامی طبقہ کے لئے جنگ آزادی ہی تھی۔

مثال کے طور پر لفٹننٹ جنرل میکلوڈائس نے لکھا ہے کہ

"کم از کم اہل اودھ کی جدوجہد کو جنگِ آزادی قرار دینا چاہئے۔"[2]

دہلی اور اودھ میں جغرافیائی، تہذیبی، اور سیاسی تعلقات کی تاریخ اور نوعیت کے علاوہ اگر یہ حقائق بھی ذہن نشین ہوں کہ ۹ رمئی ۱۸۵۷ء کو چربی سے بنے کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کے سبب میرٹھ کی ایک رجیمنٹ کے ۸۵ سپاہیوں کو کورٹ مارشل اور ۱۰ کو قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تو میرٹھ کی تین اور رجیمنٹ نے بغاوت کردی۔ نیز قیدی سپاہیوں کو رہائی دلائی، دہلی کی طرف کوچ کیا اور ۱۱ رمئی کو اس پر قبضہ کر کے بہادر شاہ ظفر کے بادشاہ ہونے کا اعلان کردیا تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ اودھ والوں کی طرح اہل دہلی کی جدوجہد بھی جنگ آزادی ہی تھی۔اس کو کسی اور نام سے یاد نہیں کیا جاسکتا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری زبان کے عظیم شاعر غالبؔ جو" سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری" کا نعرۂ مستانہ لگا کر اپنے اور اپنے آباء کی جنگجوئی اور بہادری پر ناز کرتے ہوئے جس زمین پر سانس لے رہے تھے، اس کو خود غاصب فرنگیوں نے قومی جنگ کا میدان کارزار تسلیم کیا ہے۔اس لئے کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں غالب کا کردار یا اس کے تئیں ان کا رویہ کیا تھا؟

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ غالب کی شخصیت عہد اور فکر وفن کے تعارف وتعین میں ان کے خطوط اور جنگ آزادی کے دوران فارسی زبان میں لکھے ہوئے (بقول ان کے) روزنامچہ[3] دستنبو، کو تاریخی ماخذ کی حیثیت عطا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہماری زبان کے بعض اہم نقادوں اور تذکرہ نگاروں نے انہیں تحریروں کی بنیاد پر خالص قومی نقطۂ نظر سے بھی ان کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔

۱۔ دیکھئے The Otherside of the Medal - 1930

۲۔ دیکھئے Topics For Indian Statesmen-1858

۳۔ غالب نے دستنبو کے مشاہدہ، سرگزشت اور روزنامچہ ہونے کے بارے میں جو دعوے کئے ہیں وہ غلط ثابت ہو چکے ہیں۔اس سلسلہ میں ایک مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔

یہ درست ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں بسنے والے مختلف لوگوں کے نام غالب کے متعدد خطوط سے دہلی کے حالات اور ان کے ذہنی رویے کا اندازہ ہوتا ہے لیکن روزنامچہ میں ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۰ ستمبر ۱۸۵۷ء تک کے حالات و واقعات ہی کا اندراج ہے جب برطانوی فوجی دستے دہلی میں فوجی مزاحمت پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ تذکرہ کے طور پر اس میں لکھنؤ کی شکست (جولائی ۱۸۵۸ء) تک کا ذکر موجود ہے۔

یہ روزنامچہ کیوں لکھا گیا؟ اس کا طے کر پانا بڑا مشکل ہے کیونکہ اگر ایک طرف غالب کے اردو خط (عود ہندی علی گڈھ ۱۹۲۷ء ص ۱۴) اور فارسی روزنامچہ (کلیاتِ نثر غالب لکھنؤ ۱۸۷۱ء ص ۳۸۷) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱ر مئی کو جب دہلی میں فساد شروع ہوا تو انہوں نے شہر کے عین وسط میں واقع اپنے گھر کا دروازہ کس طرح بند کر لیا اور چونکہ "بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی اس لئے اپنی سرگزشت جو اوروں سے سنی تھی لکھنا شروع کر دیا" تو دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے ہے کہ ستمبر ۱۸۵۷ء کے بعد جب حالات میں تبدیلی آئی تو انہوں نے ہندوستان اور انگلینڈ کے انگریز حکام کو محض یہ باور کرانے کے لئے اپنا فارسی روزنامچہ پیش کیا کہ

☆ وہ بغاوت میں شریک نہیں تھے۔
☆ کئی رئیس اور پنشن خوار کے جان بچا کر بھاگ جانے کے باوجود وہ دہلی ہی میں ڈٹے ہوئے تھے۔
☆ انہوں نے شاہ پرستوں اور باغیوں (حریت پسندوں) دونوں سے خود کو الگ تھلگ رکھا تھا۔
☆ ان کا خاندان ہمیشہ سے انگریزوں کا نمک حلال رہا ہے اور اسی لئے انہیں زندگی بھر کی پنشن عطا ہوئی ہے۔[1]

فارسی زبان میں بہت کچھ کہہ کر بہت کچھ چھپا لینے کی جو صلاحیت اور ایجاز و اختصار کی جو خوبی ہے، غالب نے روزنامچہ لکھنے اور انگریز سرکار میں پیش کرنے کا فیصلہ اسی خوبی کی بنیاد پر کیا تھا اور اب تو اس بات پر بھی اتفاق کر لیا گیا ہے کہ "دستنبو" روزنامچہ یا 'سرگزشت' ہے ہی نہیں بلکہ خاص مقصد سے بعد میں لکھی گئی تحریر ہے۔ اس کی زبان بھی اسی لئے مصنوعی رکھی گئی تھی کہ ہر شخص پڑھ سکے نہ سمجھ سکے اور اس طرح غالب کی انگریز دوستی پر پردہ پڑا رہے۔

۱۔ دیکھئے مکاتیب غالب (رام پور ۱۹۴۹) ص ۹ پر نواب یوسف علی خاں کے نام غالب کا ۱۴ر جنوری ۱۸۶۵ء کا ایک خط، نیز کلیات نثر غالب لکھنؤ ۱۸۷۱ء، ص ۳۸۹

اسی طرح ان کے خطوط کے بارے میں بھی محققین کا خیال ہے کہ دستیاب خطوط سے زیادہ ضائع ہو چکے ہیں اوران خطوں کو ضائع کرنے میں خود غالب کا منشاء شامل تھا مثلاً ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کی تحقیق کے مطابق والی رام پور کے نام غالب کے رازدارانہ خطوط سیاسی امور پر مشتمل تھے، اس لئے ان کی ہدایت پر ضائع کردیئے گئے۔[1]

اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ جو تحریریں ضائع ہوگئیں یا جن کے ضائع ہوجانے کا امکان ہے ان کی بنیاد پر غالب کے بارے میں کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ جو رائے قائم کی جاسکتی ہے وہ انہیں تحریروں کی بنیاد پر قائم کی جاسکتی ہے جو روزنامچوں یا خطوط کی شکل میں باقی رہ گئی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں کی روشنی میں ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے تئیں غالب کا جو رویہ سامنے آتا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ اور ان کے چہرے کو داغدار کرنے والا ہے۔

کیا غالب کا یہ رویہ محض جان و مال کی سلامتی یا پنشن کی بحالی کے لئے تھا؟ جیسا کہ بعض نقادوں نے لکھا ہے؟

خود غالب کی تحریروں سے اس نظریے کی نفی ہوتی ہے۔ یہ تحریریں اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ غالب ان لوگوں میں سرفہرست تھے جو ''مغل ماضی سے منہ موڑ کر ہندوستان کے برطانوی مستقبل پر'' سب سے پہلے ایمان لائے تھے۔ انہوں نے ملک میں انگریزوں کی فوجی قوت اور اقتدار کا نہ صرف استقبال کیا تھا بلکہ ان کے خلاف فوجی مزاحمت کرنے والوں کو باقاعدہ گالیاں دی تھیں۔ سماج میں اعلیٰ وادنیٰ کی تفریق کو تسلیم کیا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ سماج میں طبقاتی تقسیم کے ذمہ دار بذات خود غالب نہیں ہیں۔ اشراف و غیر اشراف میں، سماج بہت پہلے سے بٹا ہوا تھا مگر مذہب، اخلاق اور معاشرت میں نیک نامی سے یکسر بے نیاز ہو کر انہوں نے اپنی جو الگ راہیں بنائی تھیں، ان کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ غالب کو سماج میں طبقاتی تقسیم کے سلسلہ میں ترقی پسندانہ خیالات اور انسانوں کے مساوی ہونے کے احساسات کے بجائے انسانی سماج کی غیر فطری درجہ بندی پر اصرار کیوں تھا۔ فرنگی باجگذاروں کی طرح انہوں نے بھی اعلیٰ طبقہ سے وہ طبقہ مراد لیا ہے جو جنگ آزادی میں عموماً انگریزوں کا حلیف اور حریت پسندوں کا سخت حریف تھا۔

مثال کے طور پر ان کی یہ تحریریں۔

۱۔ دیکھئے دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے نسخہ گپتا رضا ص ۱۱۸

''جب انگریزوں نے عوامی فوج کے ہاتھوں سے شہر چھین لیا تو عام لوگ باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور گلی گلی میں لڑنے لگے۔ شہر کے بعض شہدے، کمینے شہر پر قابض بہادر انگریز فوجیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے۔ دو تین دن تک کشمیری دروازے سے آگے شہر کا گوشہ گوشہ بیچ مچ میدان جنگ بنا رہا اور باہر جانے کے تین راستے یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ باغی فوجیوں کے ہاتھوں میں رہے۔''[1]

''رفتہ رفتہ دور دراز شہروں سے خبریں آنے لگیں کہ ہر چھاؤنی میں ہر رجیمنٹ کے شوریدہ سروں نے اپنے انگریز سپہ سالاروں کو قتل کر دیا ہے۔ جس طرح ساز چھڑتے ہی رقاصہ رقص میں آ جاتی ہے اسی طرح ہزاروں نمک حرام سپاہی اور کاریگر اٹھ کھڑے ہوئے اور دل و جان سے بغاوت میں شریک ہو گئے اور دوسرے سے ایک لفظ کہے بغیر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے، ماہر جنگ سپاہیوں کے یہ بزدل دستے جھاڑو کی مانند ایک ہی شیرازہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ بے ترتیبی سے ان کے کوچ کرنے کا منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے بلکہ یہ کسی باقاعدہ سپہ سالار کی قیادت کے بغیر لڑتے بھی ہیں۔''[2]

''لو دیکھو! ہر کونے کھترے سے ایک سپاہی نمودار ہوا۔ ہر راہ سے ایک پلٹن اور ہر جانب سے ایک فوج ظاہر ہوئی۔ سبھی اس سرزمین یعنی دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ عجیب زمانہ ہے! کامران باغیوں کے مزے ہیں، اب دہلی کے شہر کے اندر اور باہر کم و بیش پچاس ہزار پیادہ اور سوار فوجی جمع ہو چکے ہیں۔''[3]

مندرجہ بالا تحریروں کی روشنی میں جن میں غالب نے حریت پسندوں اور دیسی فوجیوں کو بلا تکلف ''شہدے'' ''کمینے'' اور ''نمک حرام'' جیسے لفظوں سے گالی دینے کے ساتھ ہندوستانی کاریگروں کو بھی صلواتیں سنائی ہیں، اور انگریزوں کو ''بہادر'' کے لفظ سے نوازا ہے، ان کے قومی کردار کے بارے میں کیا صفائی دی جا سکتی ہے؟ کیا یہ سب محض جان کی سلامتی کے لئے تھا؟ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو انگریز انہیں جان سے مار ڈالتے؟ نہیں، غالب انگریزوں کی طرفداری اور وفاداری

۱۔ کلیات نثر غالب ص ۳۸۹

۲۔ // // // // ص ۳۸۲

۳۔ // // // // ص ۳۸۵

ثابت کرنے کے لئے حریت پسندوں کو اس لئے گالیاں دے رہے تھے کہ کسی طرح ان کی پنشن بحال ہو جائے جس کے مقدمے کا آغاز ۲۸ /اپریل ۱۸۲۸ء کو ہوا اور ۲۷/ جنوری ۱۸۳۱ء کو خارج کر دیا گیا۔ اس کے باوجود وہ اس کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔

مگر ایک عظیم شاعر ہی کے لئے نہیں، عام سے عام شخص کے لئے بھی کیا یہ جائز تھا کہ جب مادر وطن کو غیر ملکی شکنجوں سے نجات دلانے کی لڑائی لڑی جا رہی ہو تو وہ سر دھڑ کی بازی لگانے کے بجائے اپنی جان و مال کی سلامتی یا پنشن کی بحالی کی فکر میں اپنے ان ہم وطنوں کو ''شہدے'' ''کمینے'' اور ''نمک حرام'' جیسے لفظوں سے یاد کرے جنہوں نے قومی غیرت، اور وطنی حمیت، کیلئے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا؟

اس سوال کے جواب میں محض لیپا پوتی کی جا سکتی ہے کیونکہ بہادر شاہ ظفر کی بچی کھچی بادشاہت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی نیت سے ان کی شان میں،

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　　آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

کہنے والے غالب کے متعلق تاریخ نے یہ حقیقت بھی اپنے سینے میں محفوظ رکھی ہے کہ انہوں نے بہادر شاہ ظفر اور ان کے شہزادوں پر مظالم کے تمام حوالوں کو اپنے روزنامچہ سے حذف کر دیا تھا یا محض اتنا لکھنے پر اکتفا کیا تھا کہ

''فرشتۂ اجل نے اسے قیدِ فرنگ سے بھی آزاد کر دیا اور قید جسمانی سے بھی'' [1]

''قیصر التواریخ'' کے مطابق صرف دہلی میں ۲۷/ ہزار افراد قتل ہوئے جن میں غالب کے دوست اور جید عالم امام بخش صہبائی (ف ۱۸۵۷ء)، ان کے دو بیٹے اور مولانا محمد باقر (۱۸۵۷ء) بھی تھے جنہیں اسی احسان فراموش انگریز پرنسپل ٹیلر کی نشان دہی پر ایک ظالم انگریز افسر نے گولی سے اڑا دیا تھا جس کو کئی روز تک انہوں اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (ف ۱۸۶۹ء) جیل میں ڈالے گئے۔ جلیل القدر عالم دین علامہ فضل حق خیر آبادی کو انڈمان کی سزا دی گئی لیکن غالب محفوظ رہے کیونکہ وہ اپنے گھر میں تھے اور ان کا گھر انگریزوں کے وفادار مہاراجہ پٹیالہ کے فوجیوں کے پہرے میں تھا۔

فوج کے پہرے اور پناہ میں رہ کر غالب نے جو لکھا [2] اس میں علامہ فضل حق کا قابل قدر

---

[1] اردوئے معلیٰ، لاہور ۱۹۲۳ء ص ۱۲۰-۱۲۱

[2] یہ غالب کا دعویٰ ہے، حقیقت یہ ہے کہ دستنبو ایک خاص مقصد سے اس وقت لکھی گئی جب دلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو چکا تھا۔

ذکر ہے نہ مفتی صدرالدین آزردہ کا جو علم وفضل میں یکتا ہونے کے ساتھ ان کے بے تکلف دوست بھی تھے مگر انگریزوں اور انگریزوں کی حاشیہ برداری کرنے والوں پر امڈ آنے والی مصیبتوں پر زبردست ماتم کیا گیا ہے مثلاً یہ اندراج:-

''چوں کہ تیز سیلاب کو خس وخاشاک سے روکنا محال ہے اس لئے انگریزوں کے مددگاروں میں سے ہر ایک لاچار ہو گیا اور حالات کے بگڑنے پر گھر کی چاردیواری میں سوگوار ہو کر بیٹھ رہا۔ مجھے بھی ان ماتم داروں میں شمار کر لو۔''[1]

''انہوں نے انگریزوں کے مددگار حکیم احسن اللہ خاں کی حویلی لوٹ لی جو نگارخانہ چین کی مانند نظر آتی تھی اور استقبالیہ ہال سے متصل کمرے کو آگ لگا دی۔''[2]

غالب کی کاریگروں سے نفرت کا سبب بھی یہی ہے کہ دہلی میں حریت پسندوں کے مرکز کی جانب سے بہادر شاہ ظفر کی جو اپیل جاری کی گئی تھی، اس میں اہل حرفہ کو اچھے لفظوں میں مخاطب کیا گیا تھا اور انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں میں اہل حرفہ پیش پیش تھے۔

'' یہ ظاہر ہے کہ فرنگیوں نے ہندوستان میں انگریزی چیزوں کو رواج دے کر جولاہوں، روئی دھننے والوں، بڑھئیوں، لوہاروں اور موچیوں وغیرہ کو بیکار کر دیا ہے اور ان کے تمام پیشوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہاں تک کہ ہر قسم کا دستکار بھکاری بن کر رہ گیا ہے لیکن بادشاہی حکومت کے عہد میں صرف ملکی دستکار ہی بادشاہوں، راجاؤں اور امیروں کی ملازمت میں لئے جائیں گے۔ یہ یقیناً ان کی خوش حالی کی ضمانت ہوگی۔ اس لئے ان دستکاروں کو انگریزوں کی ملازمت ترک کر دینا چاہئے اور جنگ میں مصروف مجاہدین کی مدد کرنا چاہئے تاکہ وہ دنیاوی اور ابدی سعادت کے حقدار بنیں۔''[3]

روزنامچہ اور خطوط کی کچھ دوسری تحریریں بھی مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں اور ان تمام تحریروں میں غالب نے اپنا مافی الضمیر پیش کر دیا ہے کہ ان کو انگریز اور انگریزوں کے تمام حلیف عزیز تھے۔ وہ ہندوستانی حریت پسندوں اور ان کے حلیفوں کو ''غدار'' اور ''نمک حرام'' سمجھتے تھے۔

۱۔ کلیات نثر غالب ص ۳۸۲..........

۲۔ ،، ،، ،، ص ۳۸۷

۳۔ نیشنل ہیرالڈ دہلی، ۱۰ رمئی ۱۹۵۷ء

حکیم احسن اللہ کا ذکر اس کی واضح مثال ہے جو انگریزوں کی مدد کرنے کے سبب حریت پسندوں کے خیموں میں بہت بدنام تھے۔ عام ہندوستانی انہیں غدار سمجھتے تھے مگر غالب ان کے بہی خواہ تھے۔ اس لئے ان کی تباہی پر رنجیدہ ہوئے۔ اسی لئے ہمارے بعض بزرگ نقادوں کی اس رائے سے اتفاق کرنا بھی مشکل ہے کہ "بے گناہ انگریزوں" کے قتل عام کے بعد غالب نے ہندوستانی حریت پسندوں اور شاہ پرستوں کی مخالفت اور انگریزوں کی ہمدردی کو اپنا وطیرہ بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگِ حریت کے آغاز سے پہلے ہی غالب کے اس ذہن کی تشکیل ہو چکی تھی جس میں انگریزوں اور انگریزوں کی دہلیز پر جبیں سائی کرنے والوں کے علاوہ ان کا کسی سے کوئی رشتہ اخلاص نہیں رہ گیا تھا۔ انہیں کسی چیز کی طلب تھی تو بس منصب اور پنشن کی چاہے وہ جہاں سے اور جس قیمت پر ملے۔

غالب ہر معاملے میں اور ہر طرح سے انگریزوں کے طرفدار تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ انگریزوں کے بعض ترقی پسندانہ کارناموں ہی کے مداح تھے، صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب مغل سلطنت کے ساتھ اس کی تہذیب کے زوال اور بکھراؤ کو بھی ذہنی طور پر قبول کر چکے تھے۔ اس لئے انگریزی فوج اور اقتدار سے نہ صرف مصالحت اور مفاہمت کے خواہاں تھے بلکہ ہر قسم کی قربانی دے کر ان کے معتمد بنے رہنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے سرسید کی تالیف [1] کے لئے منظوم تقریظ یا پیش لفظ لکھتے ہوئے عصر جدید کی سائنسی ایجادات کی اہمیت تسلیم کرنے کے ساتھ انگریزوں کے شیوہ و انداز اور آئین کی بھی بے حد تعریف کی تھی۔

گرز آئیں می رود باما سخن — کس چشم بکشا وندریں دیر کہن
صاحبان انگلستان را نگر — شیوۂ و انداز ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس نہ دید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشیاں پیشی گرفت
حق ایں قومیست آئیں داشتن — کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
دادو دانش رابہم پیوستہ اند — ہندرا صد گونہ آئیں بستہ اند

اس مثنوی میں آگے چل کر اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ جب نئی زندگی کی برکتوں سے فیضیاب ہونے کے مواقع حاصل ہیں تو پھر "آئینِ اکبری" کے خرمن سے خوشہ چینی کی ضرورت ہی کیا ہے؟[2]

۱- آئین اکبری

۲- سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد، ج/۱، شمارہ نمبر ۲ ص ۲۶۶ بحوالہ احوال ونقد غالب، مرتبہ محمد حیات خاں سیال، لاہور

غالب کی ذہنی افتاد کو سمجھنے میں اس واقعے سے بھی مدد لی جاسکتی ہے کہ ایک انگریز شراب فروش میکفرسن کے دعوے کے سبب جب غالب گرفتار ہو کر داخل حوالات ہوئے تو انہوں نے کہا کہ

شادم از بندکہ از بند معاش آزادم

از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم دربند

یعنی اس قید سے خوش ہوں کیونکہ اس نے مجھے قید معاش سے بری کر رکھا ہے، اب مجھے روٹی، کپڑا داروغہ جیل پہنچاتا ہے۔[1]

مطلب یہ ہوا کہ جس شخص کو ''حوالات کی روٹی'' میں فکر معاش سے آزادی اور اس آزادی پر اطمینان قلب کا احساس ہوتا ہو وہ پنشن کی وصولی کے لئے، جو بھی کہے اور کرے وہ کم ہے۔

اصل میں غالب انگریز دوستی اور سمندر پار سے اس ملک میں در آنے والے لٹیروں کے اتنے شیدائی ہو چکے تھے کہ وہ ہر اس چیز کی مخالفت کر رہے تھے جس سے کہنہ ہونے کی بو آ رہی ہو یا جو انگریزی اقتدار کے مفاد میں نہ ہو۔ قدیم ہندوستانی نظام بادشاہت اور دیسی فوجوں کی مزاحمت سے ان کی بیزاری کی مثالیں پہلے ہی پیش کی جا چکی ہیں۔ یہاں ایک اور مثال دی جارہی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کے لئے خود کو نیم مسلمان کہہ کر اپنے اسلام کو بھی چھپانے کی کوشش کی تھی۔

اس کی وجہ اسکے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انگریز، فوج کے علاوہ مسلمانوں کو بھی جنگ آزادی کا بڑا محرک سمجھتے تھے۔ مسلمانوں پر انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑنے کا نمایاں الزام تھا۔ اس لئے مسلمان ہی انگریزوں کے قہر و عتاب کا زیادہ شکار ہوئے۔ ان کی جائیدادیں ضبط کی گئیں، وہی زیادہ تعداد میں قتل اور ملک بدر بھی ہوئے۔[2]

غالب سے یہ صورت حال پوشیدہ نہیں تھی اور وہ خوب سمجھ چکے تھے کہ انگریزوں کی نوازش، اعتماد اور پنشن کی وصولیابی میں ان کا مسلمان ہونا بھی مخل ہو سکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے بغیر تاخیر اپنے روزنامچہ میں یہ اندراج کر دیا کہ

''درحقیقت ایک آزاد منش کو واجب نہیں کہ وہ راستی پر پردہ ڈالے،

۱۔ دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے، نسخہ گپتا رضا ص ۲۰

۲۔ سر ولیم میور، سی ایف اینڈ ریوز سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اور دوسرے برطانوی مصنفین کی کتابوں کو پڑھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی قیمت مسلمانوں کو اپنے جان و مال سے دوسروں کے مقابلے زیادہ چکانی پڑی۔ ریکس نے تو لکھا ہے کہ ''مسلمان باغی کا مترادف کلمہ تھا''

خاص طور پر میرے جیسے نیم مسلمان کو جو کسی مذہب وملت کا پابند نہیں اور جو نیک نامی سے مطلق بے نیاز ہے۔''[1]

انگریزوں کے تئیں غالب کی غیر مشروط اور مکمل وفاداری کے جذبوں میں ہلچل اس وقت مچی جب پہلے پہل انہیں اودھ پر انگریزوں کے جارحانہ قبضہ کی خبر ملی۔[2] کیونکہ قبضہ سے پہلے انگریزوں نے شاہ اودھ سے جو معاہدے کیے تھے، جو یقین دہانی کی تھی، اس سے غالب، والیان ریاست اور دیگر انگریز نواز عناصر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں ان کی حیثیت برقرار رہے گی یا انہیں انعام واکرام سے نوازا جائے گا لیکن جب ویسا نہیں ہوا جیسا انہوں نے سوچا تھا تو انہیں خود اپنے مستقبل کی فکر ستانے لگی۔

بالآخر وہ دن آیا کہ غالب پر گوری شنکر مخبر کی ۱۹ر جولائی ۱۸۵۷ء کی پہنچائی ہوئی خبر کی بنیاد پر 'سکہ' کا الزام لگ گیا اور یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی میں گورنر جنرل نے ان سے اپنی قیام گاہ پر ملنے سے بھی انکار کر دیا۔[3] لہٰذا انہیں حقیقت حال کا زیادہ احساس ہوا کہ ہندوستان کے نئے فرنگی حکمرانوں سے انہوں نے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں ان کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے۔

اس کے بعد جو ہوا وہ بقول کالی داس گپتا رضا

''۱۸۶۵ء میں غالب نے حکومت سے تین مطالبات کیے کہ انہیں شاعر دربار مقرر کیا جائے، پہلے سے اونچی جگہ ملے اور 'دستنبو' حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔ حکم ہوا کہ تحقیقات کی جائے کہ 'غدر' میں غالب کا رویہ کیا تھا؟ رپوٹ ہوئی کہ ان سے 'سکہ' منسوب ہے۔ سب درخواستیں رد ہو گئیں، غالب پر 'سکہ' کا الزام ان کی زندگی میں غلط ثابت نہ ہو سکا۔[4]

(سکہ سے مراد کسی بادشاہ کی تخت نشینی کے موقع پر اس کی شان میں موزوں کی گئی نظم یا قطعہ کا

۱۔ کلیات نثر غالب ص ۴۰۷

۲۔ روزنامچہ کے اختتام پر جب غالب کو لکھنؤ کی شکست کی روداد لکھنی پڑی تو وہ رنجیدہ تھے انہوں نے سعدی کا ایک شعر لکھ کر اپنے رنج کا مکمل اظہار کر دیا ہے۔

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را　　چہ کند گوئے کہ تن در ندہد چوگاں را

(یعنی غلام اپنے آقا کے حکم کے سامنے سرخم نہ کرے تو کیا کرے؟ گیند کیا کرے اگر بلے کی ضرب نہ سہے) کلیات صفحہ ۴۰۵

۳۔ دیوان غالب کامل، نسخہ گپتا رضا ص ۱۱۹

۴۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۲۲

وہ ایک شعر ہے جو سکہ رائج الوقت پر کندہ کرا دیا جاتا تھا۔ غالب پر جس 'سکہ' کا الزام تھا وہ مالک رام کی تحقیق کے مطابق ذوق کے شاگرد حافظ غلام رسول ویرآن کا لکھا ہوا تھا جو نابینا تھے۔ یہ وہی 'ویران' ہیں جنہوں نے ظہیر دہلوی کے ساتھ مل کر پہلا 'دیوانِ ذوق' مرتب کیا تھا۔)

غالب کی انگریز نوازی کی بنیاد ہی وہ تین خواہشات ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان سے متعلق درخواستیں بعد میں رد ہوئیں لیکن ان کے رد کر دیے جانے کے امکان کا احساس انہیں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ خود مایوسی کی زندگی گزار رہے تھے بلکہ دیسی راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے بارے میں سنتے کہ وہ نئے حکمرانوں سے لو لگائے بیٹھے ہیں تو ان پر طنز کرتے تھے۔

یہی نہیں، وہ ان کے بارے میں اچھی یا حوصلہ افزا بات بھی سنتے تو مایوسی کا پہلو نکال لیتے۔ انہوں نے مہاراجہ الور کے اختیارات کی بحالی کی خبر سن کر لکھا تھا کہ

> "بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے" سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہی ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا اور آدمی کو بدنام کیا۔[2]

مسئلہ جبر و قدر کی فلسفیانہ بحث میں بھی جو اس زمانے میں عام تھی، غالب تقدیر کی برتری کے قائل تھے۔

شکست خوردہ طبقہ امراء کے مصائب پر ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے میں بھی، غالب کی اپنی پریشانیوں کا عکس موجود ہے۔ انہوں نے اس طبقہ سے اظہار ہمدردی کر کے دراصل یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انہیں کی طرح ان کا ماضی بھی ختم ہو چکا ہے اور مستقبل پر اندیشوں کا تاریک سایہ ہے۔ اس مایوسی کے باوجود وہ انگریزوں کی تعریف کرنے کا بھی کوئی موقع نہیں گنواتے تھے۔ شاید اس امید پر کہ معلوم نہیں کب ان کی تعریف کا اثر ہو اور انہیں کچھ حاصل ہو جائے۔

غالب بلاشبہ ہماری زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن اس بڑائی کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ان کے اس کردار کی پردہ پوشی کی جائے جو 'پنشن' اور 'منصب' کی خواہش میں ہندوستانیوں کی قومی حمیت اور وطنی آزادی کے حق میں فحش گالی بن گیا تھا۔

ان کے ذاتی کردار سے یقیناً صرف نظر ضروری ہے کہ کسی کی خوابگاہ میں جھانکنا اخلاقی گناہ ہے مگر 'قومی امور' میں کسی فرد واحد کے کردار کی ایسی توجیہہ جس سے وطن عزیز پر جان دینے والے

۱۔ فسانۂ غالب، ص ۱۳۴، مالک رام، دلی ۱۹۷۵ء

۲۔ عود ہندی، علی گڈھ، ۱۹۲۷ء ص ۹۳

لاکھوں وطن دوستوں کی قربانیوں پر حرف آتا ہو، اخلاقی گناہ کے ساتھ قومی گناہ بھی ہے۔

خود برطانیہ میں رہ کر برطانوی استعمار کی مذمت کرنے والوں کے خیالات اور ان خیالات کی پاداش میں ان پر گزرنے والی قیامت کا حال جان کر تو غالبؔ کے حال و قال سے اور زیادہ وحشت ہونے لگتی ہے۔

برطانیہ میں اگرچہ ہندوستانی جنگ آزادی کی خبر، برطانوی مردوں، عورتوں اور بچوں پر سپاہیوں اور حریت پسندوں کے یک طرفہ مظالم کے طور پر پہنچائی گئی تھی اور اس سلسلہ میں جس قدر جھوٹ بولے جاسکتے تھے، سب بولے گئے تھے تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناجائز حکومت کے وحشیانہ مظالم پر پردہ پڑا رہے۔ اس کے باوجود برطانوی متوسط اور مزدور طبقے ہندوستانی سپاہیوں اور حریت پسندوں کی مذمت کرنے میں ایک رائے نہیں ہوئے۔

- ☆ ان کے درمیان پہلا اختلاف یہ پیدا ہوا کہ ہندوستانیوں کو ''واحد دین برحق'' یعنی عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا جائے یا کافرانہ بت پرستی اور توہمات میں مبتلا رہنے دیا جائے۔
- ☆ دوسرا اختلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں اس کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان پیدا ہوا
- ☆ تیسرا اختلاف اس مسئلہ میں پیدا ہوا کہ ہندوستان کو برطانوی قلمرو میں شامل کیا جائے یا نہیں؟

فریقین کھل کر اپنے خیالات پیش کرتے رہے حتیٰ کہ ان خیالات کو بھی واضح لفظوں میں پیش کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کی گئی جن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدیداروں اور کارندوں کی غلط کاریوں کی مذمت اور ہندوستانیوں کے حق خود اختیاری کی حمایت کی بازگشت تھی۔

''دی ویکلی ڈسپیچ'' نے ۲۳/اگست ۱۸۵۷ء کو لکھا کہ

> ''اگر ہم ہندوؤں اور مسلمانوں سے ان جرائم کا انتقام لیں اور فرنگی حکام کو چھوڑ دیں جن کی بداعمالی ان جرائم کا موجب ہوئی تو یہ نامردی اور بے دینی ہوگی۔''

''دی انڈین ریفارمر سوسائٹی'' کے نام سے ایک پلیٹ فارم تیار ہوا اور شاعر و صحافی ارنسٹ جونز نے، جو منشوریت کی تحریک سے وابستہ تھا اور جس کو ایک عرصہ سے ہندوستانی معاملات میں دلچسپی تھی، اخباری مضامین کا سلسلہ شروع کردیا۔

۱۸۵۱ء میں یعنی ہندوستان میں جنگ آزادی کا بگل بجنے کے ۶ برس پہلے ہی اس نے جیل

میں قید و بند کی مصیبت سہنے کے دوران ایک نظم شائع کی تھی جس کا عنوان تھا" ہندوستان یا نئی دنیا کی بغاوت" اور جب واقعی ہندوستان میں مسلح مزاحمت شروع ہوگئی تو اس نے نہ صرف یہ نظم دوبارہ شائع کرنے کا حوصلہ دکھایا بلکہ اس کے دیباچہ میں برطانیہ کا مشہور نعرہ" برطانوی سلطنت پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا" میں ترمیم کی کہ" برطانیہ کی نوآبادیات پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا لیکن خون بھی کبھی خشک نہیں ہوتا۔"

ارنسٹ جونز، اپنے اخباری مضامین اور نظموں میں مسلسل برطانوی حملہ آوروں کی مذمت کررہا تھا جو برطانیہ میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ بالآخر ۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو اس نے یہ فیصلہ کن بیان دے کر روشن ضمیری کا ثبوت دیا کہ

> "بغاوت اتنی انصاف پر مبنی، اتنی برتر اور اتنی ضروری ہے کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ حیرت اس بات پر نہیں کہ ۷ ارکروڑ لوگوں نے تھوڑے تھوڑے حصوں میں بغاوت کی بلکہ حیرت اس بات کی ہے کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ ہتھیار نہ ڈالتے، اگر ان کے اپنے ہی حکمراں ان سے غداری نہ کرتے۔ وہ یکے بعد دیگرے غیر کے ہاتھوں بک گئے چنانچہ بادشاہ، والیان ریاست اور امراء اسی ملک کے بدخواہ اور اسی کے لئے باعثِ لعنت ثابت ہوئے جس کا انہوں نے ہر دور میں نمک کھایا۔"[1]

غالب یقیناً فکر و فلسفہ کے ساتھ زبان و بیان میں بھی لاثانی ہیں مگر" قومی امور یا آزادی وطن کے لئے لڑی جانے والی جنگ کے پس منظر میں ان کا کردار داغ دار ہے، اس سے بہتر تو وہ لوگ ہیں جو برطانیہ میں رہتے ہوئے ہندوستان کی آزادی کے لئے جان کی بازی لگا دینے والوں کی حمایت کا اظہار کر کے اپنے لئے نت نئی مصیبتوں کو دعوت دے رہے تھے۔

اس لئے آزاد ہندوستان میں غالب کا جشن منانے والوں کو اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ غالب کی شاعرانہ عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے ان کی زبان و قلم سے کوئی ایسا جملہ نہ نکل جائے جس سے وطن پر قربان ہو جانے والوں کی روح مجروح ہو۔

☆☆☆

۱- ملاحظہ ہو جیمز برائن کا مضمون" بغاوت ہند اور برطانوی رائے" انقلاب ۱۸۵۷ء پی. سی. جوشی، نئی دہلی ۱۹۷۲ء، ص ۲۹۹

غالب اور سرسید احمد خاں

ہندوستان کی تحریک آزادی کے پس منظر میں بظاہر تو غالب اور سرسید دونوں ہی انگریزوں کے وفادار، طبقہ امراء کے طرفدار اور شہنشاہ پرستوں کے ساتھ حریت پسندوں سے بھی بیزار نظر آتے ہیں لیکن ان دونوں کے فکری و عملی رویے میں جو فرق ہے، اس کو ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کے سماجی معاشی اور فوجی حالات کے ساتھ مذہبی اور تہذیبی معاملات کا تجزیاتی مطالعہ کئے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لئے دونوں کے فکری و عملی رویے پر تین زاویوں سے بحث کی جارہی ہے۔

(الف) اگر غالب نے لکھا کہ

''ہزاروں نمک حرام سپاہی اور کاریگر اٹھ کھڑے ہوئے اور دل و جان سے بغاوت میں شریک ہوگئے۔''[1]

تو سرسید احمد خاں نے بھی بنی نوع آدم میں اعلیٰ و ادنیٰ کی مصنوعی اور قابل مذمت تقسیم سے اپنی ذہنی وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے بنکروں کے خلاف یہ حقارت آمیز جملہ لکھا کہ

''جولاہوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا جو بدذات سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں گرم جوش تھے۔''[2]

لیکن سرسید کے اس جملہ کو عبارت کی پچھلی سطور سے ملاکر پڑھئے تو یہی حقارت آمیز جملہ اور اس کا تلخ و ترش لہجہ بنکروں یا اہل حرفہ کے تئیں سرسید کے خلوص اور ان کی تباہی سے ان کے دل دردمند میں اٹھنے والے طوفان کا ثبوت بن جاتا ہے۔

سرسید نے یہ لکھ کر کہ

''اہل حرفہ کا روزگار بہ سبب جاری اور رائج ہونے کے اشیائے تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا تھا، یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا، جولاہوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا۔ بدذات سب سے زیادہ اس ہنگامہ میں گرم جوش تھے۔''[3]

۱۔ کلیاتِ نثر غالب، لکھنؤ ۱۸۷۱ء، ص ۳۸۲

۲۔ حیات جاوید ص ۴-۹۱۳

۳۔ حوالہ سابق

اصل میں سرسید نے اہل حرفہ کی اس معاشی بدحالی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے جو فرنگیوں کی تجارتی اور صنعتی پالیسی کے سبب ان کا مقدر بن گئی تھی۔

اس میں قلق یا شکایت ہے تو بس یہ کہ بنکروں نے ہنگامی دور میں مستقبل بینی اور ضبط سے کام نہیں لیا۔ اس شکایت یا سرسید کے اس نقطۂ نظر پر بحث کی گنجائش ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ سرسید نے جو اس زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو دوسروں کی محنت مزدوری پر پھلتا پھولتا تھا، دستکاروں، بنکروں اور محنت و ہنرمندی کی روٹی کھانے والوں کے جذبات و احساسات کو سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ اس کے علاوہ بنکروں کے جذبہ حریت کو سرسید کی انگریزوں سے مفاہمت کی پالیسی پر ترجیح بھی دی جاسکتی ہے مگر سرسید کے اہل حرفہ کے تئیں خلوص پر کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا جاسکتا۔ بنکروں کو غصہ میں برا بھلا کہتے بلکہ گالی دیتے ہوئے بھی انہوں نے ان کی معاشی تباہی کا ہی ماتم کیا ہے۔

غالب محض ذاتی مرتبے اور پنشن کے خواہاں رہے ہیں، ان کی تحریروں میں اقتصادی شعور ناپید ہے اور یہی نہیں کہ وہ معاشی استحصال کا شکار ہونے والے طبقوں سے ہمدردی نہیں رکھتے بلکہ ان مظلوم طبقوں کی تحقیر بھی کرتے رہے ہیں[1]!

مجموعی طور پر غالب نے اس پورے طبقہ کی ہم نوائی کی جس کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بعد میں لکھا کہ

> ''دیسی ریاستوں کو برقرار رکھنا ہندوستان کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے ارادے سے تھا، ہندوستانی والیان ریاست ہندوستان میں برطانیہ کے ففتھ کالم کا کام کر رہے ہیں۔''[2]

اس حقیقت کو آسانی سے سمجھنے کے لئے انبالہ اور رام پور کے والیانِ ریاست سے غالب کے سعادتمندانہ اور غرض مندانہ تعلقات کا مطالعہ کرنا مفید ہوگا اور ان کے تمام مکتوب الیہم کے حالات اگر سامنے ہوں تو اس حقیقت کو سمجھنے میں مزید آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کسی کا قصیدہ پڑھیں یا ہجو کریں سب اپنے ذاتی مفاد و منفعت کے لئے ہی کرتے ہیں۔

(ب) نظم و نثر دونوں میں غالب نے اپنے عقیدہ و مذہب کے متعلق بھی جو کچھ لکھا ہے اس

۱۔ ''غالب اور شاہانِ تیموریہ'' کے صفحہ ۹۰-۱ پر ڈاکٹر خلیق انجم نے وہ الفاظ نقل کر دیئے ہیں جو غالب نے انگریزوں کی ستائش میں اور ہندوستانی سپاہیوں کی تذلیل کے لئے استعمال کئے ہیں۔ اس مضمون کی ابتداء میں مثال کے طور پر غالب کی تحریر سے ایک سطر بھی نقل کی جاچکی ہے جس میں انہوں نے سپاہیوں کے ساتھ کاریگروں کو بھی نمک حرام لکھا ہے۔

Discovery of India, Pd. Jawahar Lal Nehru, Page 268-۲

سے ان کا حنفی صوفی، تفضیلی، اثنا عشری، نیم مسلمان اور مطلقاً کافر ہونا سب ثابت ہوتا ہے اور قطع نظر اس سے کہ حالی سے کالی داس گپتا رضا تک غالب کے مذہب کے متعلق کس نے کیا لکھا ہے، ایک طالب علم کی حیثیت سے راقم الحروف یہ سمجھتا ہے کہ وقت و حالات کے تحت ہی نہیں، مخاطب و مکتوب الیہم کی رعایت سے بھی غالب کے اظہار عقیدہ میں فرق آتا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں چند مثالیں یہ ہیں:

۱- (الف) میر مہدی مجروح کے نام غالب کے ۶/۱اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہ رمضان المبارک میں کسی بھی صورت میں، جامع مسجد میں ان کی تراویح ناغہ نہیں ہوتی تھی۔ اسی خط میں مولوی جعفر علی سے حامد علی خاں کی مسجد میں ان کے قرآن پاک سننے کا بھی ذکر ہے۔ جامع مسجد میں تراویح کی پابندی (اگر انہوں نے جھوٹ نہیں لکھا تو) ان کے حنفی سنی ہونے کی دلیل ہے۔

(ب) میر مہدی مجروح ہی کو نومبر ۱۸۵۷ء میں لکھا کہ

"............میاں لڑکے سنو! میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کی، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا......صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ حفظ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں۔
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی"

(ج) غالب کے متعدد شعروں میں تصوف کے حوالے یا خود صوفی ہونے کے دعوے موجود ہیں مثلاً

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس کے علاوہ کالی داس گپتا رضا نے اپنے نسخہ میں وہ پانچوں رباعیاں نقل کر دی ہیں جو غالب نے اپنے شیعی ہونے کی نفی اور صوفی ہونے کے اثبات میں کہی تھیں۔ ان پانچ رباعیات میں ایک یہ ہے۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں وہ مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

۲۔تفضیلی مسلمانوں کا وہ فرقہ ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دیگر اصحاب باوفا ؓ خصوصاً خلفاء ثلاثہ ؓ پر فضیلت دیتا ہے۔ غالب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے شیدائی ہیں بلکہ ایک جگہ تو یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ وہ رسول اکرمؐ کو بھی حضرت علیؓ کے حوالے سے مانتے ہیں۔

نبی را پذیرم بہ پیمان او

خدارا پرستم بہ ایمان او

لیکن ان کی زندگی کا آخری کلام جو انہوں نے ۳/نومبر ۱۸۶۷ء کو نواب کلب علی خاں کو بھیجا تھا اس میں کہا ہے کہ

ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل

اس سے ان کے تفضیلی اور اثنا عشری ہونے کی نفی ہوتی ہے کیونکہ فضیلت علیؓ میں غلو کے بغیر آدمی تفضیلی یا اثنا عشری نہیں ہو سکتا۔

۳۔(الف) غالب کا خط بنام نواب علاء الدین خاں علائی، ۲۷/جولائی ۱۸۶۲ء۔ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ اثنا عشری تھے۔

''..... مقطع نبوت کا مطلع امامت، اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں....''

(ب) ۱۲ شعری سلام جس کا مطلع ہے

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو

تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

(ج) دس شعر پر مشتمل وہ قطعہ جس کا مطلع ہے

اس کتاب طرب نصاب نے جب

آب و تاب انطباع کی پائی

۴۔اپنے مذہب وعقیدہ کے متعلق غالب یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ

''..... درحقیقت ایک آزاد منش کو واجب نہیں کہ وہ راستی پر پردہ ڈالے۔ خاص طور پر میرے جیسے نیم مسلمان کو جو کسی مذہب وملت کا پابند نہیں''[1]

غالب کے ''فری میسن'' تحریک میں شریک ہونے کی روایتیں بھی موجود ہیں۔ یہ خفیہ تحریک ہے جس کا مقصد دنیا کو مذہب، اخلاق اور انسانی اقدار سے بیگانہ بنا دینا ہے۔ ان کے انتقال

۱۔کلیات نثر غالب ص ۴۰۷

کے بعد آگرے کے ماہانہ رسالے "ذخیرۂ بال گوبند" کے مارچ کے شمارے میں ان سے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں یہ اطلاع فراہم کی گئی تھی کہ

"ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیورِ اسلام اتار کر حلیۂ فریمیسن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہبِ نو اختیار کا اور کیفیت فریمیسن ہونے کی دھوکا دے دے کر اس سے دریافت کی، پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔ (احوالِ غالب: ۲۱) یہی بات ان کے ایک شاگرد حکیم محمد اشفاق حسین ذکی نے بھی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "اخیر میں وہ فرامیسن ہو گئے تھے۔" (زمانہ، کانپور، جنوری ۱۹۴۹ء: ۹)

آیا میرزا فریمیسنی حلقے میں شامل ہوئے یا نہیں، اس سے متعلق تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اگر وہ انگریز دوستوں کے خوش کرنے کو اس جماعت کے رکن بن بھی گئے ہوں، تو تعجب کا مقام نہیں۔ فریمیسن کے بارے میں اب بھی بہت کم معلومات ہے۔ اس کی سرگرمیاں صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہیں۔ مقاصد بھی عیاں نہیں ہیں اس لئے "زیورِ اسلام" اتارنے کی بات کو حتمی طور پر قبول کرنا بہت مشکل ہے لیکن مالک رام کے اس خیال سے بھی جیسا کہ انہوں نے "ذکرِ غالب" ص ۲۵۰ پر لکھا ہے کہ "فریمیسنوں میں شامل ہونے کے لئے آبائی مذہب ترک کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔" اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فری میسنوں سے متعلق جو کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں ان کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے فریمیسن ہونا ممکن نہیں ہے۔

۵- غالب کے طلسمِ خیال کی بنیاد ہی تشکیک و انکار پر ہے۔ اس کے باوجود ہم غالب کی نظم و نثر کی ان سطروں اور شعروں میں سر کھپانا ضروری نہیں سمجھتے جس سے ان کا منکرِ اسلام ہونا ثابت کیا جا سکے۔ ہمارے لئے اہم بات یہ ہے کہ غالب مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔

بسوز غالب آزادہ را و باک مدار
بشرط آں کہ تواں گفت نامسلمانش

اور جو مسلمان ہونے کے مدعی ہوں، ہم انہیں مسلمان ہی کہیں گے۔ اسکے علاوہ ان کی زندگی کے بالکل آخری دستیاب کلام میں انہوں نے اہل سنن کی دو سلطنتوں کو بقائے دوام کی دعائیں دیتے ہوئے نواب رام پور کے لئے جو دعائیں مانگی ہیں وہ کوئی مسلمان ہی مانگ سکتا ہے۔

اولاً عمر طبیعی بہ دوام اقبال
ثانیاً دولت دیدار شہنشاہ امم

غالب کے کلام اور خطوط کی تاریخی ترتیب کے سبب عام طور سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ بعد

والے عقیدہ و مسلک نے پہلے والے عقیدہ و مسلک کو منسوخ کر دیا تھا مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے مثلاً کالی داس گپتا رضا نے زین العابدین خاں عارف کے اس قطعہ کو ۱۸۴۱ء کے آس پاس کا فکر کردہ قیاس کیا ہے جس میں عارف نے اعلان کیا ہے کہ

"(اے غالب) تیرا غلام (یعنی عارف) تیرے فیض صحبت سے دل و جان سے امامت کا قائل ہو گیا ہے[1]

لیکن دیوانِ غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) میں رضا صاحب نے ان رباعیات کو ۱۸۵۰ء کے ہی آس پاس کی فکر کردہ بتایا ہے جو نومبر ۱۸۵۰ء میں دہلی کے "سید الاخبار" میں شائع ہوئی تھیں اور جن میں غالب نے نہ صرف خود کو صوفی ظاہر کیا ہے بلکہ صوفی ہونے کو شیعی ہونے کی ضد بھی کہا ہے۔[2]

اب سوال یہ ہے کہ نومبر ۱۸۵۰ء میں جس کا عقیدہ وہ رہا ہو جو پانچوں رباعیوں میں بیان کیا گیا ہے تو ان کی تربیت میں عارف ۱۸۴۱ء ہی میں اس عقیدہ کے حامل کیسے ہو سکتے تھے؟ جو ان سے منسوب کیا گیا ہے؟ اس کے علاوہ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ عارف نے دل و جان سے امامت کا قائل ہو جانے کے اعلان کے ساتھ خود کو خارجیوں کے مقابلے سنّی کہا ہے۔

سنّی اس زمرۂ خوارج میں
ہدفِ ناوکِ ملامت ہے[3]

اور یہ دونوں دعوے بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتے۔ اس لئے غالب اور عارف دونوں کے مذہب کے بارے میں کئی سوالات ماہرین غالبیات کی تحقیقات میں تشنۂ جواب رہ گئے ہیں اور اس تشنگی کی وجہ ہے غالب کی تضاد بیانی۔

مالک رام نے اس تضاد بیانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"وہ (غالب) بعض اوقات ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں، جو انہیں غلو اور اغراق کی حد میں لے آتی ہیں۔ مثلاً ایک قطعہ میں کہتے ہیں:

تا بود چار عید در عالم — برتو، یا رب! خجستہ باد و ہجر
عیدِ شوّال و عید ذی الحجہ — عیدِ بابا شجاع و عیدِ غدیر

۱۔ "غالب درونِ خانہ" ۔ کالی داس گپتا رضا۔ ص ۱۰۷
۲۔ دیوانِ غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) نسخۂ رضا ص ۴۱۱
۳۔ غالب درون خانہ۔ کالی داس گپتا رضا ص ۱۰۰

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ بالعموم ان کی شیعیت صرف اسی حد تک ہے کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام دوسرے صحابہؓ پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ انہوں نے باقی صحابۂ رسول کو ستاروں سے اور حضرت علیؓ کو چاند سے تشبیہہ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

شرطست کہ بہرِ ضبطِ آداب و رسوم خیر و بعد از نبی ، امامِ معصوم
زاجماع چہ گوئی، بہ علیؓ بازگرائے مہ جائے نشینِ مہر باشد، نہ نجوم

بلکہ انہوں نے ایک جگہ حضرت علیؓ اور پہلے تین خلفا میں تفاوت کا ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ تینوں حضرات محض خلیفہ تھے۔ لیکن امام صرف حضرت علیؓ تھے، خلافت دینی اور مادّی امور سے متعلق ہے، اور امامت دینی اور روحانی امور سے، اور اسی لئے یہ من جانب اللہ ہے۔ یہ امتیاز بالکل بے بنیاد بلکہ غلط ہے۔ یہ شیعی عقیدہ بھی نہیں ہے۔''[1]

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ غالب نے جن دو عیدوں کا ذکر کیا ہے، یہ شیعی حضرات سے مخصوص ہیں۔ ''بابا شجاع'' اس ایرانی غلام کا شیعی لقب ہے، جس نے خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ کو شہید کیا تھا، اس کا نام فیروز اور کنیت ابولولو تھی۔ اسے اس جرم کی پاداش میں جس روز قتل کیا گیا، شیعی حضرات اسے بطور عید مناتے ہیں۔

''عید غدیر'' ۱۸ ذی الحجہ کو ہوتی ہے۔ بقول شیعی حضرات اُس دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خُم نامی ایک تالاب (غدیر) کے قریب ایک خطبے میں حضرت علیؓ کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ مالک رام کو ان باریکیوں کا احساس تھا اس لئے انہوں نے غالب کو شیعہ تسلیم کرنے کے باوجود یہ وضاحت ضروری سمجھی کہ

''ان کی شیعیت .... کا امتیازی نشان تبرّا نہیں بلکہ تولاّ ہے یعنی وہ عموماً دوسرے صحابہؓ پر تبرّا نہیں کرتے بلکہ حضرت علیؓ سے اپنے تولاّ اور محبت کا شدت سے اظہار کرتے ہیں۔''[2]

کالی داس گپتا رضا نے بھی یہی روش اختیار کی ہے۔ غالب کو شیعی لکھنے کے بعد انہیں بھی اعتراف کرنا پڑا ہے

۱- مالک رام، ذکرِ غالب، نئی دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۲۴۷
۲- مالک رام، ذکرِ غالب، نئی دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۲۴۸

"غالب بھی اپنے تخیل کے نشہ میں مست ہو کر طرح طرح کے شعر کہہ جاتا ہے اسے مذہب و مسلک کی چہار دیواری کا ہوش کہاں رہتا ہے؟ اس مجنون چمن کا دامن رنگ اور شگفتگی سے ہمیشہ بھرا رہتا ہے" ۱

سر سید کی مذہبی فکر یا اجتہاد سے لاکھ اختلاف کیا جائے لیکن یہ اختلاف سر سید کی قرآن و سنت کو سمجھنے سمجھانے کی مخلصانہ و مجتہدانہ کوششوں اور اسلام کو ایسے قابل فہم، معقول اور کردار ساز مذہب کی شکل میں پیش کرنے کی جدوجہد پر سوالیہ نشان نہیں لگاتا، انہوں نے بار بار جتایا ہے کہ

"اسلام نے جن چیزوں کو اچھا یا برا بتایا ہے وہ وہی ہیں جو فطرت کی رو سے اچھی یا بری ہیں، پس وہ بری چیزوں سے بچنے کی، ان کو یقینی برا مان کر اور اچھی چیزوں کے حاصل کرنے کی ان کو یقینی اچھا جان کر کوشش کرتے ہیں اور ٹھیٹ مسلمان اور سچے تابعدار سچی شریعت کے ہوتے ہیں، گناہ بھی کرتے ہیں اور گنہگار بھی ہوتے ہیں مگر دغاباز اور مکار اور ریاکار نہیں ہوتے۔" ۲

یہی نہیں، سر سید نے مسلمانوں کی انفرادی اجتماعی زندگی میں جن چیزوں کی تہذیب و تزئین پر بہت زیادہ زور دیا ہے، ان میں عقائد کی درستی اور مذہبی حقائق تک رسائی کو اولیت حاصل ہے۔ ان ہی کے لفظوں میں،

"ہندوستان میں مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو ان کے دلوں میں ہیں اور جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس ان کی تہذیب کرنا اور اپنے عقائد کو سنت اسلام کے مطابق کرنا اور اسی پر یقین رکھنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔" ۳

اس لئے اعتقادات و تشریحات میں سر سید سے بنیادی اختلاف کے باوجود ان پر موقع یا مخاطب کو دیکھ کر اپنے مسلک میں تبدیلی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی طرح اگرچہ شاہ اسمٰعیل دہلوی کے فتوے سے اختلاف کرتے ہوئے سر سید نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ انگریزی حکومت کی امان میں رہنے والے جہاد نہیں کر سکتے اور ایک مقام پر جہاد کا نعرہ بلند کرنے والوں کو "بدرویہ"، "بداطوار"،

۱۔ غالب درونِ خانہ۔ کالی داس گپتا رضا، ص ۵۰
۲۔ مقالات سر سید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، حصہ دوم ص ۲۲
۳۔ منتخب مضامین سر سید۔ مرتبہ عتیق احمد صدیقی۔ ص ۴۷

''شراب خور'' اور ''تماش بین'' کہہ کر ان کو غیر مذہبی ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے تا کہ ان کی قیادت تسلیم نہ کی جا سکے تاہم اس حقیقت کو ان کی مذہبی فکر سے اختلاف کرنے والے بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ سرسید کی یہ تمام کوششیں ان کی اس خواہش اور خواہش کی تکمیل کی شعوری جدوجہد کا نتیجہ تھیں کہ مسلمانوں کے سر سے الزام بغاوت ڈھل جائے، انگریزوں اور مسلمانوں میں کشاکش نہ رہے اور مسلمان برطانوی ہندوستان میں حکمرانوں کا اعتماد اور اعلیٰ عہدے حاصل کر سکیں۔

غالبؔ کے پیش نظر ایسا کوئی بڑا مقصد نہیں تھا۔ انہوں نے انگریزوں یا انگریزوں کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے والیان ریاست سے جو بھی تعلق استوار کیا، ذاتی منفعت کے لئے ہی کیا تھا، ان کا عقیدہ ان کے ممدوح کے مذہب و مسلک سے ہم رشتہ رہا ہے، جبکہ سرسید احمد خاں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر تہمت دھرنے والوں کے نہ صرف جوابات دیئے ہیں بلکہ کتابیں لکھی ہیں اور جواب دینے کے لئے لندن تک کا سفر بھی کیا ہے۔[1]

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ سرسید کو ہمارے علماء نے جس طرح پیش کیا ہے یا ان کے ایمان واعتقاد کے بارے میں جو فیصلے دیئے ہیں، وہ انتہا پسندی کے مظہر ہیں کیونکہ سرسید کی زندگی میں ایک پل بھی ایسا نہیں آیا جب وہ توحید، رسالت اور آخرت کے عقیدے یا قرآن وسنت کے فیصلوں کے منکر ہوئے ہوں، انہوں نے قرآن حکیم کے کلامِ الٰہی اور پیغمبر اسلام ﷺ کے نبی آخر الزماں ہونے کے اقرار کے ساتھ تعبیر وتشریح میں اپنی نئی راہ نکالی ہے اور ہر شخص کو حق ہے کہ ان کی اس راہ کو مسترد کر دے۔ راقم الحروف بھی سرسید کی مذہبی فکر میں ان کی تاویل وتشریح کو قطعاً مسترد کرتا ہے لیکن یہ حق کسی کو نہیں ہے کہ وہ ان کی نیت یا اخلاص کو شک کے دائرے میں لائے۔

سرسید ۱۸۴۶ء تک نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی طور پر بھی اس مذہبی گروہ کے ہم نوا، ہم قدم اور ہم عقیدہ رہے ہیں، انگریزوں نے جن کو وہابی کہا ہے۔[2] اس کے علاوہ دلی کی بلند رتبہ شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی کتاب میں وہابیوں کو نہ صرف شامل کیا ہے بلکہ وہابیوں کی دعوتِ جہاد کے مذہبی تقدس کو بڑے ولولے کے ساتھ پیش کیا ہے اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے والے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کو مسلمانوں کی سب سے زیادہ سربراوردہ شخصیت، مسلمہ قائد اور

۱۔ الخطبات الاحمدیہ۔ سرسید احمد خاں

۲۔ حیات جاوید (دہلی ۱۹۹۰ء) ص ۱۷۶ پر حالی نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ''انڈین مسلمانز (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) پر سرسید کے تبصرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سرسید نے اس تبصرے میں خود کو وہابی لکھا ہے۔ یہ تبصرہ پائینر میں شائع ہوا تھا بعد میں اسے کتابچے کی شکل میں شائع کر کے تقسیم کیا گیا۔

اپنا استاد بھی لکھا ہے۔

سید احمد بریلوی اور شاہ محمد اسمٰعیلؒ کی وفات کے پندرہ سال بعد بھی جب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتوے پر عمل کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند پیدل چل کر شمال مغربی سرحدی صوبہ کی دور دراز بستی ''ستانہ'' جارہے تھے تاکہ وہاں سے انگریزوں کے خلاف جہاد کر سکیں تب بھی سرسید احمد خاں احکام محمدی ﷺ کی اطاعت کرنے والوں کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ ان کے خیال میں جہاد انتہائی مقدس عبادت تھی جس کا ثواب جہاد کے قائد شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی روح پاک کو ان کے انتقال کے بعد بھی پہنچتا تھا۔

سطور بالا میں سرسید کے جو خیالات پیش کئے گئے ہیں ان کی کتاب ''آثار الصنادید'' (طبع اوّل ۱۸۴۶ء) کے باب چہارم میں شائع ہو چکے ہیں لیکن بعد میں اس کتاب کے جو نسخے شائع ہوئے ان میں سے وہ باب حذف کر دیا گیا تھا۔ ایک عرصے بعد میں انجمن ترقی اردو، پاکستان نے اس باب کو دوبارہ، ''تذکرۂ اہل دہلی'' (اردو) کے عنوان سے شائع کیا۔[1]

زندگی کے آخری برسوں میں جب سرسید انگریزوں کے طرفدار ہو گئے اور انہوں نے مولوی چراغ علی (ف ۱۸۹۵ء) کو جہاد سے متعلق آیات قرآنی کی ایسی تفسیر کرنے کے لئے آمادہ کیا جس کی رو سے جہاد فرض عین نہیں بلکہ، فرض کفایہ قرار پاتا ہے۔[2] اس وقت بھی ان کے ایمان وعقیدہ میں فرق نہیں آیا۔ وہ بدستور، دین خالص پر اپنے ایمان واعتقاد کا اظہار کرتے رہے حتیٰ کہ جہاد کے بھی منکر نہیں ہوئے، صرف اس کی تفسیر وتشریح میں دوسرے علماء سے اختلاف کیا کہ جہاد کن حالات میں ہو۔

یہی نہیں وہ عقیدہ میں اتنے راسخ تھے کہ بہادر شاہ ظفر کے راسخ العقیدہ مسلمان نہ ہونے کی بات اگرچہ انہوں نے بعض مولویوں کے حوالے سے کہی ہے مگر اس میں خود ان کی روح عقیدہ بھی موجود ہے:

> ''دلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں کا اور ان کے تابعین (متبعین) کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رو سے معزول بادشاہ دلی کو بہت برا اور بدعتی سمجھتا تھا، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبضہ و دخل اور اہتمام ہے، ان

۱۔ آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کے چوتھے باب میں دلی کی مشہور اور نامور شخصیتوں کے ذکر ہیں۔ اس سے ۱۲۰ مشاہیر کا حال معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ تحقیق الجہاد، چراغ علی، ص ۷ ۱۳

مسجدوں میں نماز درست نہیں چنانچہ وہ جامع مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملے میں موجود ہیں۔''[1]

اگر ہم کمالِ اختصار سے کام لیں تو پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کے اس تجزیہ کو سرسید کے عقیدہ و عمل کے آئینہ کے طور پر پیش کر سکتے ہیں:

''آخر میں ہم مختصراً کہہ سکتے ہیں کہ سرسید نے تفسیر اور علم کلام کے ذریعہ اسلام میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، انہوں نے ماضی کے ان مسلم فضلاء کا تتبع کیا جو کہ عقلیت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے۔ ان کی ذاتی زندگی ایک راسخ العقیدہ اور پاکباز مسلمان کی زندگی تھی لیکن وہ یورپ کے عملی تحقیق کے اسالیب (Western Methodology) کی اہمیت سے متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے مسلم دانشوروں کو اس سے روشناس کرانے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا، اس سلسلہ میں ان کا کہنا تھا کہ جہاں اسلام مانع نہیں ہے وہاں یورپ کی پیروی مفید ہوگی''[2]

غالب نہ تو عقیدہ میں راسخ تھے نہ انگریز دوستی سے کسی ایسے مقصد کے حصول کے قائل جس کا فائدہ پوری ملت کو آنے والی صدیوں تک ملتا رہے۔ انگریزوں کے متعلق سرسید اور غالب کی فکر میں اسی بنیادی اختلاف کا نتیجہ تھا کہ سرسید نے ''آئینِ اکبری'' پر غالب کی تقریظ کو قبول کرنے اور شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹) سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸) سے بیس برس بڑے تھے لیکن ان دونوں میں جو مخلصانہ تعلقات تھے وہ پورے ادب و اخلاص کے ساتھ آخری دم تک قائم رہے۔ دیوان غالب کی پہلی اشاعت (۱۸۴۱ء) سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر متوفی (۱۸۴۶ء) کے لیتھوگرافک مطبع میں ہوئی تھی۔ ۱۸۴۷ء میں مطبع سید الاخبار سے جب سرسید نے ''آثار الصنادید'' شائع کی تو اس میں غالب کی نثر کا نہ صرف اچھا خاصا انتخاب شامل تھا بلکہ غالب کی تعریف و توصیف کے ساتھ ان سے اپنے خصوصی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ

۱۔ اسباب بغاوت ہند۔ سرسید احمد خاں ص ۱۰۸

۲۔ سرسید، ولی اللّٰہی تحریک اور وہابی تحریک کے اثرات، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی ص ۱۰۶، فکر و نظر علی گڈھ اکتوبر ۱۹۹۲ء

"راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آ سکتا ہے اور چونکہ

دلہا را بدلہا راہ باشد

ان حضرت کو بھی شفقت راقم کے حال پر ہے شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا از حال ان لوگوں پر جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں اور جواہر گرانمایہ آپ سے حاصل کرتے ہیں۔"[1]

'آثار الصنادید' پر غالب کی تقریظ بھی ہے۔ نثر میں لکھی ہوئی اس تقریظ میں غالب نے اپنی عادت کے خلاف اس کی بڑی تعریف کی ہے، یہ کتاب بہت مقبول ہوئی لیکن مقفع و مسجع زبان و اسلوب کے بارے میں کچھ تبصرے بھی ہوئے اور تاریخ کی کتاب میں زبان و بیان کا وہ انداز ناپسند کیا گیا جو سرسید نے اختیار کیا تھا۔ ۴-۱۸۵۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا تو اس میں ارباب دہلی سے متعلق حصے کو حذف کر دیا گیا تھا۔

انگریزوں میں ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کے متعلق ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی خاص شوق پیدا ہو چکا تھا اور اپنی حیرت انگیز تفاصیل کے سبب 'آئینِ اکبری' (مصنفہ ابوالفضل) ان کی پسندیدہ کتاب تھی۔ سرسید نے وقت کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس کو مرتب کیا تھا اور ترتیب و تصحیح کا ایک خاص معیار و انداز اختیار کیا تھا۔

'آئینِ اکبری' پر سرسید نے غالب سے تقریظ لکھنے کی درخواست کی۔ غالب 'آئینِ اکبری' سے ناواقف نہیں تھے کیونکہ وہ شاہان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر ۱۸۵۰ء ہی میں قلعہ معلیٰ میں ملازم ہوئے تھے۔ انہوں نے سرسید کی خواہش و فرمائش کے احترام میں ایک منظوم تقریظ لکھی جو غالب کی معجز بیانی کا زبردست نمونہ ہے۔ اس میں لندن اور کلکتہ سے ابھرنے والے نئے آئین اور نئی قوتوں کی طرف دیکھنے اور کہنہ و فرسودہ روایتوں سے دامن چھڑانے کی تلقین کی گئی تھی۔

غالب کی یہ منظوم تقریظ، سرسید احمد خاں کی جگر کاوی، جانفشانی اور تحقیق میں کمال محنت و توجہ کا صحیح اعتراف نہیں تھا۔ سرسید نے "آئینِ اکبری" کے صرف غیر صحیح اور سقیم نسخوں ہی کی تصحیح نہیں کی تھی بلکہ انسانوں، جانوروں، درختوں اور اشیاء کی تصاویر جمع کرنے میں خونِ جگر بھی صرف کیا تھا اور

۱۔ سید احمد خاں، آثار الصنادید، باب ۴ ص ۱۳۸، مطبع سید الاخبار، دہلی ۱۸۴۷ء

ان کی اس علمی کاوش کی امام بخش صہبائی نے فارسی میں اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے عربی میں تقاریظ لکھ کر داد بھی دی تھی۔ سر سید غالب کی منظوم تقریظ کو پڑھ کر خوش نہیں ہوئے کیونکہ اس میں یہی نہیں کہ ان کی علمی جانفشانی، تحقیقی کاوش اور سلیقہ مندی کا اعتراف نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک طرح سے یہ طعنہ بھی دیا گیا تھا کہ جب زندگی کے آداب و انداز بدل رہے ہیں تو آئین کہن (آئین اکبری) پر اڑنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

صاحبان انگلستاں رانگر	شیوہ و انداز ایناں رانگر
تاچہ آئین ہاپدید آوردہ اند	انچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زین ہنرمندان ہنر بیشی گرفت	سعی بر پیشیان پیشی گرفت
حق این قوم است آئین داشتن	کس نیارو ملک بہ زین داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند	ہند را صد گونہ آئین بستہ اند
آتشی کز سنگ بیرون آورند	این ہنرمندانِ زخس چون آورند
پیش این آئین کہ دارد روزگار	گشتہ آئین دگر تقویم پار
ہست انے فرزانہ ٔ بیدار مغز	در کتاب این گونہ آمین ہائے نغز
چون چنین گنج گہر بیند کسے	خوشہ ٔ زان خرمن چرا بیند کسے
طرز تحریرش اگر گوئی خوش است	نے فروں از ہرچہ بیجوئی خوش است
ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است	گر سرے است افسرے ہم بودہ است
بندہ ٔ فیاض رامشمر بخیل	نور میرزد رطب بازان بخیل
مردہ پرور دن مبارک کار نیست	خود بگو کان نیز جز گفتار نیست

یہ تقریظ پڑھ کر سر سید ناخوش ہوئے اور اس کو ''آئین اکبری'' میں شامل نہیں کیا۔

اور ابھی سر سید کے دل میں ناخوشی کا احساس باقی ہی تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی چھڑ گئی اور پھر وہ بساط ہی الٹ گئی جس کی فرسودگی و کہنگی کی طرف غالب نے اشارے کئے تھے۔

سر سید نے جنگ آزادی کو بغاوت کہا ہے لیکن اس کو ایک نئے انداز سے پیش کر کے انگریزوں کو اس کے برپا ہونے کے اسباب بھی بتائے ہیں اور مسلمانوں کے متعلق ان کے نقطہ نظر اور سلوک میں تبدیلی کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

سر سید، غالب کے ۳۵ برس بعد کلکتہ پہنچے اور جب وہاں سے واپس آئے تو وہاں کے روشن خیال طبقے کے زیر اثر '' سائنٹفک سوسائٹی'' کا تخیل (۱۸۶۴ء) ساتھ لائے۔ اسی طرح جب وہ

۱۸۷۰ء میں لندن سے لوٹے تو 'تہذیب الاخلاق' اور کالج (مسلم یونیورسٹی) کا تخیل و منصوبہ ساتھ لائے۔

نوعیت اور اصل حقیقت کو سمجھے بغیر اس بات کو عمومی حیثیت میں تسلیم کرلیا گیا ہے کہ غالب کی ''دستنبو'' اور سرسید احمد خاں کی ''اسبابِ بغاوت ہند'' دونوں کتب انگریزوں سے وفاداری اور دیسی طاقتوں کے خلاف بدیسی طاقتوں کی طرفداری کی مظہر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کی ''دستنبو'' کا اگر سرسید احمد خاں کی کسی کتاب سے موازنہ ہوسکتا ہے تو وہ ''تاریخ سرکشی بجنور'' ہے۔ اس میں سرسید کی آراء کی ترجمانی نہیں ہے۔ یہ فقط ضلع بجنور میں جنگ آزادی کی چشم دید گواہی یا تاریخ ہے۔ لیکن یہ موازنہ بھی ظلم ہوگا کیونکہ ''تاریخ سرکشی بجنور'' کی اشاعت کے پس پردہ سرسید احمد خاں کی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی لیکن ''دستنبو''، قطع نظر اس سے کہ غالب نے اس کے بارے میں اور اس میں کتنی غلط بیانیاں کی ہیں، ایک خاص اور بالکل ذاتی مقصد کے تحت لکھی گئی تھی، غالب کے لفظوں میں

> ''اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے کے جابجا نذر کرنے کا سبب یہ ہے کہ سائل محکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے''۔[1]

''اسبابِ بغاوت ہند'' کی اشاعت کا محرک یقیناً سرسید کی خیر خواہی کا جذبہ رہا ہے لیکن یہ خیر خواہی کا جذبہ فرنگی حکمرانوں کے لئے نہیں تھا یا کم از کم اتنا نہیں تھا جتنا مسلمانانِ ہند کے لئے تھا۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو فرنگیوں کے عتاب سے بچانے اور تعلیم و ترقی کے ساتھ انتظامی امور میں ہم وطنوں کے ساتھ ہم مذہبوں کو بھی شریک کرنے کے خواہاں تھے۔ یہ کتاب ان کی اسی خواہش کا عملی اظہار ہے۔

سرسید نے پہلی جنگ آزادی کو یقیناً بغاوت کہا ہے جو صحیح نہیں ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر سرسید بھی بغاوت کو جنگِ آزادی کہہ دیتے تو وہ ان مقاصد کے حصول کی توقع نہیں کرسکتے تھے جن کے لئے اس کتاب کی اشاعت کی گئی تھی۔

جنگ آزادی کو بغاوت لکھ کر بھی سرسید نے اس کی ذمہ داری انگریزوں پر ہی ڈالی ہے اور نہ صرف یہ کہ مسلمانانِ ہند کو اس بغاوت کے الزام سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے بلکہ بڑی خوبصورتی سے انگریز حکومت کی ذہنی پالیسی، ادائے مال گزاری اور انگریز حکام کی بدمزاجی اور ترش روئی پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ مثال کے طور پر پیش ہیں اس کے چند اقتباسات :

(الف) ''اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہوگیا۔ زمینداروں، کاشتکاروں کو

۱۔ غالب بنام غلام غوث خاں بے خبر، فروری ۱۸۵۹ء

نقصان عائد ہوئے۔ رفتہ رفتہ وہ بے سامان ہو گئے۔''

(ب) ''ادائے مال گذاری کے لئے وہ قرض دار ہوئے، سود قرضہ زیادہ ہونے لگا۔ بہت سے زمیندار مالگذار جو بہت اچھا سامان اور معقول خرچ رکھتے تھے مفلس ہو گئے ...... غرضیکہ ان اسباب سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مفلسی نے گھیر لیا......''

(ج) ''اگلی عملداریوں میں بلاشبہ حقیقت زمینداری کی خانگی بیع اور رہن اور ہبہ کا دستور تھا، مگر یہ بہت کم ہوتا تھا اور جہاں جہاں ہوتا تھا بہ رضامندی اور بہ خوشی ہوتا تھا۔ بعلت باقی یا بعلت قرضہ جبراً اور تحکماً نیلام حقیقت کا کبھی دستور نہیں ہوا۔ ہماری گورنمنٹ نے اس کا مطلق خیال نہ کیا۔ ابتدائے عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں باقی ہوگا جس میں تھوڑا بہت انتقال نہ ہوا ہو۔''

(د) ''بعوض زر قرضہ نیلام حقیقت کے رواج نے بہت سے فساد برپا کیے، مہاجنوں اور روپیہ والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپیہ دیئے اور قصداً ان کی زمینداری چھیننے کو بہت فریب برپا کیے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمے لگائے اور قدیم زمینداروں کو بے دخل کیا اور خود مالک بن گئے، ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔''

(ہ) ''حال میں جس حکام متعہد ان میں سے اکثر کی طبیعتیں اس کے برعکس ہیں، کیا ان کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو ان کی آنکھوں میں ناچیز نہیں کر دیا ہے۔''

بغاوت یا سرکشی کے اسباب کے بطور سرسید نے پانچ باتوں کی نشاندہی کی ہے، ان کی نگاہ میں بغاوت کی اصل محرک انگریزی حکومت کا ہندوستانیوں کو لیجسلیٹیو کاؤنسل میں نمائندگی نہ دینا تھا جس کے سبب عوام اور حکومت کا ربط قائم نہ رہ سکا اور حکومت اپنے بنائے ہوئے قوانین کے نفاذ پر ہندوستانیوں کے ردعمل سے ناواقف رہی۔

باقی باتوں کو انہوں نے ضمناً لیکن جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً بغاوت کے دوسرے سبب کے بطور انہوں نے ان قوانین کی نشاندہی کی ہے جن سے صرف عیسائیت قبول کرنے والے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ عورتوں کی خود مختار، لاخراج اراضی کی خطی، زمینداری کی نیلامی، اراضی کے بندوبست میں سختی، مسلمانوں کی نوکریوں میں کم داخلے، دستکاروں، ہنرمندوں اور محنت کشوں کی بے

قدری و بے کاری،

تیسرا سبب انہوں نے عوام سے حکومت کی عدم توجہی، عوامی مسائل سے ناواقفیت (Bond) کے ذریعہ قرض کے حصول، سود، اخراجات اور ہندوستانیوں کی مفلسی کو قرار دیا ہے،

چوتھے سبب میں انہوں نے انگریز حکام کی بدمزاجی کے ساتھ بنکروں کی صنعت کی تباہی، نسلی امتیاز اور انگلینڈ سے کپڑے کے ساتھ دوسری مصنوعات کی درآمدات کو شامل کیا ہے۔

اور پانچویں سبب کو انہوں نے فوج کی بدانتظامی سے جوڑا ہے۔

مجموعی حیثیت سے اسباب بغاوت ہند، ایک ماہر نبض شناس کی وہ تشخیص ہے جس سے مسلمانانِ ہند کے سماجی اقتصادی امراض کا علاج کرنا مقصود ہے۔ یہ انگریزوں کے کسی مزاج داں خوشامدی کا اپنی مقصد براری کے لئے ان کے حق میں قصیدہ نہیں ہے۔ اس لئے سرسید احمد خاں اور غالب، انگریزوں کی طرفداری میں دور سے ہم رنگ نظر آنے کے باوجود قریب سے دیکھنے پر مزاج وطبیعت اور فطرت وخصلت میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ثابت ہوتے ہیں۔ سرسید یقیناً ان عالموں اور حریت پسندوں کے خلاف ہوگئے تھے جو انگریزوں سے نبردآزما تھے مگر انہوں نے انگریزوں کو پسپا کرنے کے لئے نئے محاذ کھولے تھے۔ تعلیمی ترقی، اقتصادی آسودگی اور زمینی اصلاحات سے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے کی تحریک دلانے کے محاذ اور یہ محاذ بھی کچھ کم اہم نہیں تھے۔

سرسید کی فکر میں تبدیلیاں نقطہ عروج پر اس وقت پہنچیں جب انقلاب ۱۸۵۷ء جس کو انہوں نے ''غدر'' کہا ہے، ناکام ہوگیا اور اس غدر کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر انگریز مسلمانوں کو ان کی جائیدادوں سے بے دخل اور پھر تہہ تیغ کرنے لگے تھے۔

غالب انقلاب ستاون سے پہلے ہی انگریزوں کی بلا واسطہ خوشامد کر رہے تھے یا ان کے حلیف نواب یوسف علی خاں ناظم جیسوں کے توسط سے۔ انہیں پینشن اور منصب کی آرزو تھی یا پھر مرجانے کی۔[۱]

☆☆☆

۱۔ ''غالب آخری عمر میں موت کی بہت زیادہ آرزو کیا کرتے تھے۔ ہر سال اپنی موت کی تاریخ نکالتے کہ اس سال ضرور مرجاؤں گا۔'' کالی داس گپتا رضا، غالب درون خانہ ص ۴۷

دستنبو[1] پر ایک نظر

غالب نے اپنی فارسی تصنیف 'دستنبو' کے بارے میں دو دعوے کئے ہیں۔
اوّل اس کے روزنامچہ ہونے کے بارے میں اور
دوم اس کے سرگزشت اور مشاہدہ ہونے کے بارے میں
یہ دونوں دعوے انہی کے لفظوں میں یہ ہیں:

(۱) "میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۷ء تک کی روداد نثر میں فارسی نا آمیختہ بہ عربی لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب آگرے کے مفید الخلائق میں چھپنے کو گئی ہے۔ 'دستنبو' اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدہ کے بیان سے کام رکھا ہے۔[2]

(۲) "........ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی۔"[3]

غالب کے کچھ اور خطوط بھی دستیاب ہیں جن میں انہوں نے اپنے مندرجہ بالا دونوں دعوے دہرائے ہیں[4] لیکن اب ان دونوں دعووں کا جھوٹ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔[5] حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اس کتاب کو چند دنوں میں لکھا تھا اور ان انگریزوں کے حضور معذرت طلبی اور پنشن و

۱۔ فرہنگ فارسی (معین) میں لفظ دستنبو تین طرح سے لکھا گیا ہے۔ (الف) دست انبوئے (ب) دستنبوئے (ج) 'دستنبو'۔ اس کا مطلب عطریات کا وہ مرکب ہے جو ہاتھ پر لگا کر وقفہ وقفہ سے سونگھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے ہر خوشبودار میوہ بھی مراد ہے۔ (ہر میوۂ خوشبو)۔ غالب کی مراد عطریات کے مرکب سے ہے جس کو ہاتھ پر لگا کر سونگھتے ہیں۔

۲۔ غالب بنام انورالدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء

۳۔ غالب بنام چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء

۴۔ غالب بنام منشی ہرگوپال تفتہ۔ ۱۷ر اگست ۱۸۵۸ء بنام میر مہدی مجروح ۸ر اگست ۱۸۵۸ء خاتمہ دستنبو۔

۵۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ اور عبداللطیف، مرتبہ و مترجمہ خلیق احمد نظامی، دہلی، غدر کی صبح و شام، حسن نظامی ص ۱۶۹

خلعت خواہی کے لئے پیش کیا تھا۔[1] جو ان سے ملنا پسند کرتے تھے نہ ان کے خطوں کا جواب دینا۔[2]

غالب نے اگر روزنامچہ کے طور پر واقعات لکھے ہوتے تو ان واقعات کا تاریخ وار اندراج ہوتا لیکن دستنبو میں نہ صرف یہ کہ بہت سارے واقعات کی تاریخیں نہیں دی گئی ہیں بلکہ واقعات کی ترتیب بھی غلط ہے۔[3]

دلی میں قتل وخون اور لوٹ مار کے دوران اہل محلّہ کے گلی کا دروازہ بند کرنے، پتھر کی دیوار چننے اور مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی رکھوالی کرنے کا اعتراف خود غالب نے کیا ہے۔[4] اس لئے یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ وہ گھر سے باہر نکلے ہوں گے یا باہر والوں نے گھر میں آ کر انہیں گلی کوچوں کا حال بتایا ہوگا۔ اس کے باوجود انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ

''اس تحریر کے سلسلہ میں میرا سارا سرمایہ سخن ہائے شنیدہ ہیں اور ابھی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں۔....''[5]

اس لئے دستنبو کو روزنامچہ، مشاہدہ اور سرگزشت تسلیم کرنا مناسب نہ ہوگا۔ یہ کتاب نہ صرف قیامت گزر جانے کے بعد لکھی گئی تھی بلکہ ایک خاص مقصد سے لکھی گئی تھی اور اس خاص مقصد کا غالب نے کھل کر اظہار بھی کر دیا ہے۔

''....کاش میری ان تینوں خواہشوں یعنی خطاب وخلعت اور پنشن کے اجراء کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے.................اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کرلوں گا تو اس دنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا''[6]

بعض خطوط میں بھی انہوں نے دستنبو کے مقصد تصنیف پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً غلام غوث خاں بےخبر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے کے جابجا نذر کرنے کا

۱۔ غالب بنام غلام غوث خاں بےخبر۔ فروری ۱۸۵۹ء

۲۔ غالب بنام خواجہ غلام غوث خاں بےخبر، اواخر مارچ ۱۸۶۰ء

۳۔ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب اور شاہانِ تیموریہ ص ۹۴

۴۔ دستنبو میں یہ تمام تفصیلات موجود ہیں۔

۵۔ دستنبو

۶۔ دستنبو

سبب یہ ہے کہ سائل محکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔"[1]

کسی کتاب کے مقصد تصنیف کے بارے میں مصنف کی اس درجہ تضاد بیانی اس کی قلبی ذہنی کشمکش ظاہر کرتی ہے اور غالب کی ذہنی کشمکش کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے نمک خوار رہ چکے تھے مگر انگریزوں کو باور کرانا چاہتے تھے کہ بہادر شاہ سے ان کے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے ایک بہرے اور ضعیف شخص کے ہو سکتے ہیں۔

اس دور میں بھی انگریزوں کی خوشامد اور ان کے لئے مخبری کرنے والوں کو عام ہندوستانی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور غالب کی نظر میں حکیم احسن اللہ خاں کا حشر بھی تھا جن کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ہم نوا ہیں، اس لئے وہ کسی حد تک محتاط بھی ہو گئے تھے مگر انگریزوں سے خطاب و خلعت اور پنشن پانے کی خواہش میں انہیں کے قدموں میں بچھے رہتے تھے۔ البتہ انگریزوں کی خوشامد جاری رکھنے اور ہندوستانیوں کی نگاہوں میں بھی اچھے بنے رہنے کا ایک طریقہ انہوں نے یہ نکالا کہ 'دستنبو' کے لئے ایک مصنوعی زبان اختیار کی۔

یہ زبان غالب، ان کے عہد یا ان کے ممدوح انگریزوں کی زبان نہیں تھی جس کو اختیار کیا جاتا۔ بلکہ یہ زبان محض اس لئے استعمال کی گئی تھی کہ عبارت آرائی میں ہندوستانیوں سے اپنا اصلی چہرہ چھپانے کے علاوہ انگریزوں پر اپنی زبان دانی کا رعب بھی جمایا جا سکے۔ اس لئے انہوں نے اپنے متعدد خطوط میں 'دستنبو' کی زبان پر فخر کا اظہار کیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں بتایا ہے کہ اس میں دساتیر کی جعلی زبان کیوں استعمال کی گئی ہے؟ حالانکہ یہ بتانا بہت ضروری تھا کیونکہ سرگزشت اور روزنامچے آسان اور روزمرہ کی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ غالب ذاتی نوعیت کے خطوط میں بھی سچی باتیں لکھنے سے ڈرتے تھے۔[2] اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے ایک ایسی کتاب میں، جس کی ایک جلد گورنر جنرل اور دوسری انگلستان کی ملکہ کو بھیجی جانے والی تھی۔[3] وہ بھی بڑے اہتمام کے

۱۔ غالب بنام غلام غوث خاں بے خبر، فروری ۱۸۵۹ء

۲۔ غالب نے اپنے کئی خطوط میں لکھا ہے کہ یہاں کے حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ یہاں صرف ایک خط (بنام حکیم غلام نجف خاں۔ ۱۹ر جنوری ۱۸۵۸ء) کا حوالہ دیا جا رہا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ "...... اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون"

۳۔ غالب بنام ہرگوپال تفتہ، اگست ۱۸۵۸ء، بنام حاتم علی مہر ستمبر ۱۸۵۸ء بنام آرام ۱۳ر اگست ۱۸۵۸ء

ساتھ خصوصی جلدوں میں[1] اپنی یا اہل دہلی کی سرگزشت کو صحیح صحیح بیان کیا ہوگا۔

'دستنبو' حریت پسندوں کی مذمت، انگریز مقتولین پر اظہار غم اور بہادر شاہ ظفر سے اپنی لاتعلقی ثابت کرنے کے لئے لکھی گئی تھی تا کہ غالب کو موروثی جائیداد کے علاوہ خلعت و اعزاز بھی حاصل ہو جائیں اور وہ مغلیہ دور کی طرح ہی انگریزی دور میں بھی ٹھاٹ کی زندگی بسر کرتے رہیں۔

رشید حسن خاں نے دستنبو کی اشاعت اوّل کے ایک ایسے نسخے کا ذکر کیا ہے جس کے آخر میں غالب کے قلم سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

''نورچشم بالمکند برہمن ایں رسالہ را بہر دفع چشم زخم دہر تعویذ بازو سازند[2]

اس عبارت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے خیال میں یہ رسالہ ہی انگریزوں کے قہر وعتاب کو لطف و کرم سے بدل سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کی تصنیف کو ضروری سمجھا اور انگریزوں کے لطف و کرم یعنی خطاب وخلعت اور پنشن کے حصول کے لئے لکھی گئی اس کتاب کے مقصد تصنیف کو حد درجہ چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ جھوٹ جھوٹ ہوتا ہے، چاہے اس کو کتنا ہی خوبصورت بنا کر بولا جائے، اس لئے غالب کی عبارت آرائی کے باوجود سب سے پہلے صاحب مطبع منشی شیونرائن آرام کو، جن کی نگاہ سے یہ کتاب سب سے پہلے گزری تھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ کتاب ''سرکار کی فتح کا حال ہے'' اور انہوں نے یہی جملہ کتاب کے آخر میں لکھ بھی دیا تھا۔

غالب کو معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے لکھا کہ

''آخر کے صفحے کی دو سطریں از روئے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا۔ صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے۔''[3]

اس کے علاوہ 'دستنبو' کے سرورق پر نام کے ساتھ چھپنے والے القاب وخطابات کے سلسلہ میں بھی واضح ہدایات دیں تا کہ القاب و خطابات سے ان کا ماضی، قلعہ معلیٰ یا والی قلعہ معلیٰ سے ان کا دیرینہ تعلق نہ ظاہر ہو جائے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو انسانی زندگی کا المیہ کہا جائے یا فطرت انسانی کی نیرنگی کہ بعض اوقات انسان کو انہیں نعمتوں اور نسبتوں کو چھپانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو اسے برسوں کی کوششوں اور

۱۔ غالب بنام حاتم علی مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء، اکتوبر ۱۸۵۸ء، بنام شیونرائن آرام ۲۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء

۲۔ رشید حسن خان، دیباچہ 'غالب اور انقلاب ستاون' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ص ۵

۳۔ غالب بنام منشی شیونرائن آرام، ستمبر ۱۸۵۸ء

خواہشوں کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔ غالب ہی کو لیجئے، وہ بڑی آرزوؤں اور کوششوں کے بعد "استاذ شہ" کے منصب تک پہنچے تھے اور انہیں بہادر شاہ ظفر سے جو القاب و خطابات ملے تھے، وہ یونہی نہیں مل گئے تھے بلکہ اس کے لئے انہیں استعارات و تشبیہات کے ڈھیر لگانے پڑے تھے یعنی انہوں نے اس کے لئے ایک چراغ مردہ (بہادر شاہ ظفر) کو آفتاب عالمتاب، جمشید، بہرام اور کیخسرو کا نظیر ٹھہرانے کی کوشش کی تھی لیکن اسے ان کی طوطا چشمی کہئے یا وقت و حالات کی عطا کی ہوئی مجبوری کہ بہادر شاہ ظفر کے معتوب ہوتے ہی انہوں نے نہ صرف ان کا ذکر کرنا چھوڑ دیا بلکہ ان کے عطا کئے ہوئے القاب و خطابات کو بھی میلے کپڑے کی طرح اتار کر پھینک دیا۔ 'دستنبو' کے سرورق پر غالب کا نام اور نام کے ساتھ القاب و خطابات انہیں کی ہدایت اور تاکید کے مطابق لکھے ہوئے ہیں، تفتہ کو لکھتے ہیں:

"منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ بہادر کا اور بہادر کے بعد تخلص"[۱]

اس سلسلہ میں تفتہ کے مزید استفسار پر انہوں نے لکھا کہ:

"سنو صاحب! لفظ مبارک میم، حا' میم' دال (محمدؐ) اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی 'محمد اسد اللہ خاں' نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا میرزا، و مولنا و نواب، اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے، جو چاہو سو لکھو"[۲]

چنانچہ دستنبو کے پہلے اڈیشن پر ان کا نام اس طرح لکھا ہوا ہے

"فردوسی ہند نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب تخلص دہلوی"

غالب کا بہادر شاہ ظفر سے تعلق ملازم اور آقا کا تھا اور دنیا میں ایسے بہت سے ملازم ہوئے ہیں جو برے دنوں میں اپنے آقاؤں سے منحرف ہو گئے تھے یا جنہوں نے اپنے پرانے آقاؤں سے تعلقات کی پردہ پوشی کی کوشش کی تھی۔ اس لئے غالب کا خوشحال مستقبل کی تلاش میں یا قہر و عتاب سے بچنے کے لئے انگریزوں کی خوشامد کرنا اور قلعہ اور والی قلعہ سے لاتعلقی ظاہر کرنا حتٰی کہ بہادر شاہ ظفر کے بصد بیکسی (۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء) گرفتار کئے جانے، مرزا مغل، مرزا خضر، ظفر کے پوتے مرزا ابوبکر اور دوسرے شہزادوں کے نہایت بے دردی سے قتل کئے جانے کو نظر انداز کرنا اگرچہ سخت افسوسناک

۱۔ غالب بنام منشی ہرگوپال تفتہ، ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء

۲۔ غالب بنام منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

ہے مگر اس سے زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ انہوں نے اپنے حقیقی بھائی کے قتل کو بھی موت کہہ کر حقیقی قاتلوں یعنی انگریزوں کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس وقت حالات سازگار نہیں تھے۔ گھر سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ غالب اپنے حقیقی بھائی کی نماز جنازہ نہ پڑھ سکے ہوں گے، نہ قبر میں اتار سکے ہوں گے۔ لیکن قتل کو موت کہنے کی اس کے سوا کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ انگریزوں کو اپنے بھائی کا قاتل کہنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے؟

مرزا یوسف غالب کے حقیقی بھائی تھے۔ عمر میں دو سال چھوٹے اور تقریباً ۳۰ سال سے دیوانے ہو گئے تھے۔ ان کی موت (قتل) کے متعلق غالب کا بیان ہے کہ

> ''۱۹؍اکتوبر کو پیر کے دن نے، جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہئے، آتش فشاں ازدہے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کمبخت دربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتارِ راہِ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی، رومال، غسال، گورکن، اینٹ، چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت) کہاں لے جاؤں؟......''[۱]

لیکن اب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مرزا یوسف حالت جنون میں گھر سے باہر نکل آئے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ مارے گئے تھے جو انگریزوں سے لڑ رہے تھے۔

معین الدین حسن خان نے مٹکاف کی فرمائش پر ۱۸۵۷ء کے حالات پر مشتمل 'خدنگ غدر' نامی کتاب لکھی تھی اس میں اس واقعہ کا ذکر ان لفظوں میں موجود ہے:

> ''مرزا یوسف برادر خورد اسد اللہ خاں غالبؔ کہ قدیم مجنون تھے، حالت جنون میں گھر سے باہر نکل کر ٹہلنے لگے، وہ بھی مارے گئے.......''[۲]

یہی بات بگا بیگم نے بھی اختصار سے دوہرائی ہے۔ وہ مرزا زین العابدین خاں عارفؔ کی بہو اور مرزا باقر علی خاں کامل کی بیوی تھیں۔ شاید انہوں نے قتل کا واقعہ گھر میں سنا ہو۔ حمید احمد خاں نے 'احوال غالب' میں ان کا بیان بھی نقل کیا ہے۔

مالک رام نے غالب اور مندرجہ بالا دونوں اشخاص (معین الدین حسن خاں اور حمید احمد

۱۔ دستنبو (ترجمہ رشید حسن خاں)

۲۔ غالب اور شاہانِ تیموریہ ص ۱۰۲، بحوالہ خدنگ غدر، ۱۴ الف بحوالہ صحیفہ غالب نمبر ص ۱۷۲

خاں) کے بیانوں کا موازنہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ مرزا یوسف انگریزوں کے ہاتھوں ہی قتل ہوئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مخدومی جناب قاضی عبدالودود صاحب کا خیال یہ ہے کہ غالب نے جان بوجھ کر حقیقت کے خلاف لکھا ہے۔ اصل بات وہ ہے جو معین الدین حسن خاں اور بگا بیگم نے کہی یعنی میرزا یوسف انگریز کی گولی کا شکار ہوئے تھے .... اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان دونوں شہادتوں پر شبہ کریں۔

بات وہی ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ میرزا غالب نے مصلحتاً حقیقت پر پردہ ڈالا اور یہ نہ لکھا کہ وہ انگریز کے ہاتھ سے مارے گئے تاکہ ان کے خداوند مجازی جنہیں وہ یہ کتاب نذر کرنے والے تھے، کہیں اس سے ناراض نہ ہو جائیں''[1]

ان تمام حقائق سے ظاہر ہے کہ 'دستنبو' انگریزوں کی شان میں غالب کا لکھا ہوا ایک نثری قصیدہ ہے جس میں انہوں نے ان بدیسی حملہ آوروں اور ان کے ہندوستانی طرفداروں (غداروں) کی مدح میں نہ صرف انتہائی غلو اور جھوٹ کے مظاہرے کئے ہیں بلکہ ہندوستانی حریت پسندوں کے لئے، جو وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لئے انگریزوں کے خلاف مسلح مزاحمت کر رہے تھے اور جن کے حق میں خود برطانیہ سے بھی آوازیں اٹھنے لگی تھیں، کثرت سے گالی نما الفاظ استعمال کئے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم[2] نے ایسے تمام الفاظ چن کر الگ لکھ دیئے ہیں

انگریزوں کی مدح میں لکھے ہوئے الفاظ

ازخوانِ این جہانستانان نان یافتہ ام (ص ۵)

جہانداران دادآموز، دانش اندوز، نکوخوے، نکونا (۶-۷)

آزادان ونیک نہاداں (ص ۳۳)......شیر مردان (ص ۱۱)

ہژبرانِ خشمگیں (ص ۱۵)......کشورکشایان (ص ۱۷)

ہندوستانی سپاہیوں کو گالیاں

سپاہِ کینہ خواہ (ص ۶)...... بے آزرم وشرانگیز (ص ۶)......کورمکان (ص ۷)

زشت سرشت (ص ۱۵)......آوارۂ چند وبیتارۂ چند (ص ۱۵)......روسیاہانِ گم کردہ (ص ۱۶)

گرازان (ص ۱۶)......بدان و بدگہران (ص ۳۳)...... کہ گردن (سپاہیانِ ہند) از

۱۔ مالک رام۔ میرزا یوسف۔ نوائے ادب بمبئی۔ اپریل ۱۹۵۹ء ص ۱۱-۱۲

۲- غالب اور شاہانِ تیموریہ، خلیق انجم، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۹۰-۹۱

فرمانداں (انگریز) پیچیدہ، سرش در دخور کفش است (ص ۳۵-۳۶)

ان تمام لفظوں اور ترکیبوں سے انگریز مقتولین سے ان کی شدید ہمدردی ظاہر ہوتی ہے اور انگریزوں کے ہاتھوں مارے جانے والے ہزاروں ہندوستانی عورتوں، مردوں اور بچوں کے بہیمانہ قتل کو یہ کہہ کر جائز ثابت کرنے کی کوشش کہ فاتح ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ غالب کی یہ روش نہ صرف موقع پرستی اور غلامانہ ذہنیت کو اجاگر کرتی ہے بلکہ ان کی انسانیت دوستی پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ غالبؔ کس مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ خود قاتل اور قاتل ٹولے کے افراد کے اقبال جرم کے باوجود آخر دم تک ان کا دفاع کرتے رہے۔[۱]

'دستنبو' کی ابتداء میں انہوں نے خدا کی مدح وثنا کے بعد وفاداری اور بغاوت کا جو فلسفہ بیان کیا ہے۔ وہ بھی انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ اس کو فلسفہ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ میثاق غلامی ہے۔ نئے حکمرانوں ہزاروں بے گناہوں (جس میں ان کے حقیقی یا گل بھائی بھی تھے) کے قاتلوں اور بدیسی حملہ آوروں سے غیر مشروط اظہار وفاداری ہے۔ اس کو ۱۸۵۷ء میں دلی اور اہل دلی پر گذرنے والی قیامت، اس دور کے سماجی سیاسی حالات یا انگریزوں کے سلسلہ میں ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر کا آئینہ کہنا بھی غلط ہے۔ یہ مصنوعی زبان میں غیر حقیقی واقعات واحساسات کا مرقع ہے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کو "رستخیز بےجا" کہنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ غالبؔ آزادی کی لڑائی میں ان ظالم بدیسی قوتوں کے طرفدار تھے جو ہندوستان کو تباہ کرنے اور غلام بنانے کے درپے تھیں۔

☆☆☆

۱۔ دستنبو اور خطوط میں اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں اور اس کتاب میں بھی جا بجا پیش کیے گئے ہیں۔

غالب کی قصیدہ گوئی

قصیدہ کہنے کا موقع نکال لینے میں غالب کو اپنے ہم عصروں پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ وہ ایک عمدہ قصیدہ گو تھے اور اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے ممدوح تلاش کرتے رہتے تھے۔

قصیدہ کہنے کے لئے دل کی اعانت، زبان و دل کی رفاقت یا ممدوح سے جذباتی اور قلبی وابستگی بھی ان کے لئے ضروری نہیں تھی بلکہ وہ جب جس کے لئے چاہتے تھے موزونیِ طبع اور ذخیرۂ الفاظ یعنی بے پناہ شعری قدرت اظہار کے سہارے مدحیہ اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ وہ بھی ایسے جنہیں سن کر ناطقہ سر بگریباں ہو جائے۔

قصیدہ نگاری کا مقصد محض صاحبان اقتدار و ثروت کی مبالغہ آمیز تعریف نہیں ہے۔ اس صنف سخن کے ذریعہ عربی فارسی شعراء نے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے فنی اظہار میں اپنی بے پناہ علمی لسانی توانائیاں صرف کی ہیں اور ممدوحین کے شخصی کردار اور معنوی محاسن کے بیان کے ساتھ انفرادی اجتماعی زندگی کے تقاضوں اور ملکی و ملی ضرورتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ خصوصاً قصیدہ کا ابتدائیہ جس کو تشبیب کہتے ہیں، موضوعات کی رنگارنگی اور تنوع کا مظہر رہا ہے۔ اس میں کسی قصیدہ گو نے حسن و عشق کے راز و نیاز بیان کئے ہیں تو کسی نے ہر رنگ میں بہار کے اثبات پر زور بیان صرف کیا ہے۔ کسی نے منظر و پس منظر کے درمیان کے پردے ہٹائے ہیں تو کسی نے فخر و تعلّی کے اظہار کے نئے پہلو نکالے ہیں۔

تشبیب کے علاوہ مجموعی طور پر بھی شاعری میں قومی، سیاسی، تاریخی، مذہبی، اخلاقی اور عرفانی موضوعات کے بیان کے لئے قصیدہ سے بہتر کوئی صنف نہیں ہے۔ تاریخی واقعات کے بیان کے لئے بھی اس صنف سے بہت کام لیا گیا ہے لہٰذا بعض قصیدوں کو تاریخی دستاویز یا تاریخی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

قصائد سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں۔ خصوصا دور مشروطہ کے شعراء نے پر شکوہ قصیدوں کے ذریعہ عوام کے حقوق کی نشاندہی کی اور عوام کو انقلاب کی ترغیب دی ہے۔ ملک الشعراء بہار کے قصاید ملکی و ملی مسائل کے ماخذ کا کام کرتے ہیں۔

قصائد میں کتنا تنوع ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فارسی شعراء کی ایک بیاض ''مونس الاحرار'' (۷۴۱ھ) کے مولف محمد بن بدرالدین جاجرمی نے اپنے اس مجموعہ میں

۲۹ ابواب قائم کیے ہیں جن میں ۲۳ صرف قصائد سے متعلق ہیں۔

علوم و فنون کا ذکر جس صنف سخن میں سب سے زیادہ ہوا ہے وہ بھی قصیدہ ہی ہے۔ علم نجوم و ہیئت، ریاضی و موسیقی، حیوان شناسی اور علم طبقات الارض وغیرہ کا بیان اس صنف میں مل جاتا ہے۔ مرثیہ بھی موضوع کے لحاظ سے ایک طرح کا قصیدہ ہی ہے جس میں زندوں کے بجائے مرحومین کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔ بہت سے قصیدہ گو شعراء نے اپنا پورا زور قصیدے کی تشبیب پر صرف کیا ہے۔ نئے الفاظ، تراکیب اور اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ فارسی کے بیشتر عظیم شعراء مثلاً ناصر خسرو، سنائی، حسن غزنوی، خاقانی... وغیرہ قصیدہ گو تھے لیکن معاشرہ میں فنی ریزہ کاری کا رواج ختم ہونے اور علمی انحطاط شروع ہونے کے ساتھ قصیدہ گوئی بھی زوال پذیر ہو کر ختم ہو گئی تھی۔

ہندوستان میں عرفی جیسے شاعر کے سبب قصیدہ گوئی نے سنبھالا لیا اور اس میں ایک بار پھر وہی دلکشی نظر آنے لگی جو قدما کی خصوصیت تھی۔ عرفی کے قصائد شاعری میں فکری عناصر کی شمولیت، انسانی اقدار کی برتری اور مضمون آفرینی کے ساتھ تشبیہات بدیع اور جدتِ طرز ادا سے عبارت ہیں۔

غالب نے بھی پہلے فارسی میں اور پھر فارسی روایت کی توسیع کرتے ہوئے اردو میں قصائد لکھے ہیں۔ یہ قصائد ان کے ذہن رسا اور قادر الکلامی کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں۔ ذیل میں ان کے ایک فارسی قصیدے کے چند اشعار سے، اس میں کئی علوم اور موضوعات کی سمائی کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ معمولی کام نہیں ہے۔ اس پہلو سے غالب کی ہم سری کوئی ایرانی شاعر ہی کر سکتا ہے۔

مگر مرا دل کافر بود شب میلاد	کہ ظلمتش دہد از گور اہل عصیان یاد
بہ طالعی زعدم آمدم بہ باغ وجود	کہ رفتہ بود بدروازۂ ارم شدّاد
خروش مرگ کہ طوفان نا امید یہاست	غریو یاس کہ مرگی بہ نو مبارک باد
طلوع نشہ بیم ہلاک طالع وقت	ہجوم عرض بلا ہای تازہ عرض بلاد
جحیم ناظر و خشم خدای مستولی	سہیم دشمن و ہیلاج دیدۂ حساد
قضا نگارش اسرار شکل زائچہ را	کند ز دود دل درد مند اخذ مداد
بگوی زائچہ کاین نسخہ ایست از اسقام	مگوی زائچہ کاین جامعست از اضداد
خود اصل طالع من جزوی از کمانستی	کز دست ناوک غم راہزار گونہ کشاد
خرام زہرہ بطالع اگرچہ دادہ نشان	ہم از لطافت طبع و ہم از صفای نہاد
دلی از انکہ غریب است زہرہ اندر قوس	نشستہ بر رخ نقد قبول گرد کساد

تو گوئی از اثر انتقام ہاروت است — کہ مر بہ طالع من چرخ زہرہ را جاداد
بہ صفر جدی ذنب را اشارہٴ باشد — بخاک و حلقہٴ دام و کمین گاہ صیاد
بحوت در شدہ ہم مشتری و ہم مریخ — یکی کفیل صلاح و یکی دلیل فساد
قمر بہ ثور کہ کاشانہٴ ششم باشد — چو نور خویش کند دستگاہ خصم زیاد
سیاہ گشتہ دو پیکر زسیلی کیوان — چنانکہ از اثر خاک تیرہ گردد باد
بدیں دو نحس نگر تا چہ شکل مستقبل — کشیدہ اندز تربیع خویش دراوتاد
بہ چار مین کدہ بہرام پنجمین پایہ — بہ ہفتمیں زدہ کیوان ہشتمین بنیاد
کند چو ترک ستمگر بہ کشتن استعجال — کند چون ہندوی رہزن بہ بردن استبداد
زحوت ہیبت طوفان نوح پردہ کشا — عیان زصورت جوزا نہیب صرصر عاد

فارسی میں سوال و جواب کے انداز میں قصیدہ لکھنے میں عنصری، فرخی، امیر معزی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بعض ہندوستانی فارسی شاعروں مثلاً عمید لویکی (ساتویں صدی ہجری) نے بھی ایسے قصیدے کہے ہیں۔ ایسا ہی ایک قصیدہ غالب کا بھی ہے مگر مکمل قصیدہ اس صنعت میں نہیں ہے:

رفتم آشفتہ و سرمست و پس از لابہ ولاغ — گفتم اینک دل و دین گفت وخوشت باد کجاست
گفتم اسرار نہانی زتو پرسش دارم — گفت جز محرمی ذات کہ بیچون و چراست
گفتمش چیست جہان گفت سراپردہٴ راز — گفتمش چیست سخن گفت جگر گوشہٴ ماست
گفتم از کثرت ووحدت سنی گوی برمز — گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست
گفتم آیا چہ بود کشمکش ردو قبول — گفت آہ از سر این رشتہ کہ در دست قضاست
گفتمش ذرہ بخورشید رسد گفت محال — گفتمش کوشش من در طلبش گفت رواست
گفتم آن خسرو خوبان بہ سخن گوش نہد — گفت گر گوش نہد زہرہٴ گفتار کر است
گفتم آن بیت کہ ہموارہ سرائی از کیست — گفت غالب کہ ہم از غالب آشفتہ نواست
گفتم از چیست کہ چون شمع گداز نفسم — گفت ای جا پدر روشنی طبع بلاست
برہ بیت شرف مہر چراشد گفتم — گفت کاشانہٴ سرہنگ ہر دوسراست

غالب کے دوسرے قصائد اس معیار کے نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے قصیدہ گوئی پر تمام تر قدرت و کمال رکھنے کے باوجود اس صنف پر وہ توجہ نہیں دی ہے جس کی یہ متقاضی ہے۔ غزل گو غالب کی طرح قصیدہ گو غالب بھی غیر معمولی ذہن، اظہار بیان کی قدرت اور لسانی فنی عبقریت کے مالک ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ ان کی ساری خوبیاں عطاء و بخشش اور

صاحبان اقتدار و ثروت کی خوشنودی حاصل کرنے کے بے پناہ جذبے تلے بتدریج مفقود ہوتی چلی گئی ہیں۔ انہوں نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ

''اس قصیدہ سے مجھ کو عرض دستگاہ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔''[1]

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ غالبؔ قصیدہ گوئی کو تاعمر یافت اور حصول عطاء و بخشش کے وسیلے کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے انہیں نہایت پاکباز و خوددار اور فرشتہ سیرت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بالآخر انہیں بھی اعتراف کرنا پڑا ہے کہ

''مرزا کی ساری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گذری کیونکہ ضرورت انسان سے سب کچھ کراتی ہے''[2]

اس اعتراف کے ساتھ دوسروں کے علاوہ خود حالیؔ کے ان تمام دعووں اور بیانوں کی نفی ہو جاتی ہے جن میں انہوں نے غالب کو عظیم شاعر کے ساتھ عظیم و خوددار انسان بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مندرجہ بالا اعتراف کی روشنی میں درج ذیل بیان کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟

''..... باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا مگر حفظ وضع و خودداری کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ شہر کے امراء و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی ... عمائد شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے، وہ بھی کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے۔''[3]

اس لئے غالب کے متعلق معلومات کا سب سے اہم ذریعہ سمجھی جانے والی کتاب ''یادگار غالب'' یا اس سلسلہ کی دوسری کتابوں میں بیان کی گئی روایات پر کوئی رائے قائم کرتے ہوئے قاضی عبدالودود کی ان سطور کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے:

''حالی غالب کے نہایت عقیدت مند شاگرد تھے، اور مرنجاں مرنج شخص، غالب کے سسرالی اعزہ اور ان کے دوسرے تلامذہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے، صرف یہی نہیں کہ انہوں نے کچھ باتیں جو ان کے علم میں تھیں،

۱۔ غالب بنام نواب یوسف مرزا۔ ۲۸ نومبر ۱۸۵۹

۲۔ یادگار غالب، خواجہ الطاف حسین حالی، ص ۷۵

۳۔ // // // // // // ص ۶۴

بمصلحت درجِ یادگار نہیں کیں، انہوں نے محاسن کو بڑھا کر اور معائب کو یکسر قلم انداز کرنا ممکن نہ ہوا تو گھٹا کر دکھایا۔ ان کی پاسداری اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے جب انہیں غالب کے کسی مخالف کا ہنر بھی عیب نظر آتا ہے۔

.....................صرف یہی نہیں کہ اس زمانے میں جو تحریری مواد تھا، اس سے بہت کم کام لیا، انہوں نے حالات کی تحقیق کے لئے تصانیف غالب کا غائر مطالعہ بھی غیر ضروری متصور کیا۔ اور کتابوں سے بحث نہیں، حالی کی یادگار کے دیکھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ردو قبول روایات کا کوی معقول معیار ان کے پاس نہیں، اور اس پر طرہ یہ کہ سہل انگار ہیں۔ نتائج صحیح نہیں نکالتے اور حوالہ یا تو مطلقاً نہیں دیتے، یا دیتے ہیں تو اس کا صحیح طریقہ اختیار نہیں کرتے، انہوں نے بعض اوقات فارسی سے ترجمہ کرنے میں تصرف کیا ہے، شرح اشعار میں اپنی طرف سے بات بڑھائی ہے، اور بعض اشعار کا متن غلط پیش کیا ہے۔ اردو میں اسد اور فارسی میں غالب تخلص تھا۔ بطور شاذ فارسی میں بھی اسد تخلص آیا ہے، اور غالب تخلص دونوں زبانوں میں ہے۔ چنانچہ ان کا اردو دیوان دیوانِ غالب کہا جاتا ہے۔'' [1]

غالب کی قصیدہ گوئی کو محض ضرورت و مجبوری کا تقاضہ کہنا بھی اسی تصویر کا دوسرا رخ ہے جس کا ایک رخ غالب سے متعلق مولانا حالی کی تحریروں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ظ۔ انصاری لکھتے ہیں کہ

''وہ غالب جسے امیروں کے آستانوں پر، شکستہ دربار کی ہلکی پھلکی محفلوں میں، گورنر کی بارگاہ میں سر جھکا کر قصیدہ یا قطعہ پیش کرنے کی مجبوری درپیش رہی، روزمرہ کی زندگی کے ہاتھوں بے بس اور موروثی عادات کے شکنجوں میں جکڑا ہوا غالب ہے۔'' [2]

لیکن حقائق سے اس قسم کے بیانات کی تصدیق نہیں ہوتی کیونکہ وہ اس وقت بھی نئے نئے ممدوحین کو قصیدہ پیش کرتے رہتے تھے جب بہت زیادہ مجبور و ضرورتمند نہیں تھے۔

غالب کے ممدوح اگر صرف بہادر شاہ ظفر ہوتے جن کے بندہ، نوکر، مصاحب اور بعد

۱۔ قاضی عبدالودود، مقالہ افتتاحیہ، بین الاقوامی غالب سیمینار ۶۹ء دہلی ص ۹۔ ۵۸

۲۔ غالب شناسی، ظ انصاری، ۲۔ ص ۲۱

میں استاذ ہونے پر وہ فخر کیا کرتے تھے تو ان کی اس قصیدہ خوانی کو ان کی دلی محبت اور خلوص پر محمول کیا جاتا لیکن ان کے قصیدوں کی تفصیل سے ان کے مزاج وطبیعت کی جو نیرنگیاں سامنے آتی ہیں ان کی روشنی میں ان کی غیرت وخودداری ہی نہیں، ممدوح سے وفاداری بھی مشکوک ہوجاتی ہے اور کسی طرح وفاداری ثابت بھی کردی جائے تو وفاداری میں استواری تو بالکل نہیں ہے۔

جان وعزت بچانے کے لئے اگر کوئی کسی ذی اقتدار کی ناجائز تعریف بھی کرلے تو مہذب دنیا گوارا کرلیتی ہے لیکن مدح کو ضرورت ومنفعت سے جوڑ لینے والوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔ غالب نے اگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہوجانے کے بعد کے خصوصی حالات میں انگریزوں کے عتاب وقہر سے بچنے کے لئے ان کی خوشامد کی ہوتی یا قصائد لکھے ہوتے تو شاید کوئی عذر پیش کیا جاسکتا تھا مگر انگریزوں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی ان کا ان بدیسی حملہ آوروں کی طرف عقیدت سے راغب ہوجانا، ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے مظالم خصوصاً بہادر شاہ ظفر اور ان کے شاہزادوں پر قہر وعتاب کو دیکھ لینے کے باوجود ان کی مدح کرتے رہنا اور پھر منفعت کے لئے ممدوح بدلتے رہنا ان کا ایسا اخلاقی گناہ ہے جس کی کوئی ایسی تاویل نہیں کی جاسکتی جو قابل قبول ہو۔

بعض ماہرین غالبیات نے یہ فلسفیانہ بات لکھ کر غالب کے اس اخلاقی گناہ کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے کہ مختصر سی انسانی زندگی میں آسائش کی تلاش گناہ نہیں بلکہ جبر میں اختیار کے دائرہ کی وسعت ہے۔ بعض دوسروں نے نشاندہی کی ہے کہ کبھی کبھی مایوسی کے اظہار کے باوجود زمانہ کے متعلق نظم ونثر دونوں میں غالب کی جو آواز ہے وہ استقبال کی ہے۔ وہ زمانہ کو کوستے نہیں بلکہ اس سے امیدیں وابستہ کرتے ہوئے دنیا کو مشورہ دیتے ہیں کہ ایسے اصحاب نظر سے رہنمائی حاصل کرتے رہو جو سینہ میں چھپے ہوئے شرارے دیکھ لیں۔

لیکن یہ فلسفہ کا مسئلہ نہیں بلکہ صاف صاف نیت وذہنیت کا معاملہ ہے اور اس سلسلہ میں حقیقت یہ ہے کہ

اک گونہ بے خودی دن رات چاہئے

اور

الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

کا نعرۂ مستانہ بلند کرنے والے غالب، حقیقی دنیا کے گوشت پوست کے اس غالب سے قطعی مختلف ہیں جو مرنے سے پہلے اپنی پیش گوئیوں میں کئی بار مر چکے تھے اور جن کا قول وفعل دونوں اعتبار سے دنیا کو مشورہ تھا کہ انسان کو شہد کی نہیں مصری کی مکھی بننا چاہئے کیونکہ شہد سے

حصول لذت و مٹھاس کے ساتھ اس میں ڈوبنے کا بھی خطرہ رہتا ہے جبکہ مصری میں لذت و مٹھاس تو ہوتی ہے لیکن اس میں ڈوبنے کا خطرہ نہیں رہتا۔

در دہر فرو رفتۂ لذت نتواں بود　　　برقند نہ برشہد تشنید مگس ما را

اسی لئے جب تک غالب کو ڈوبنے کا خطرہ نہیں تھا وہ 'چراغ مردہ' کو 'مہر عالمتاب' کہنا اپنی شان سمجھتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ان کے کم از کم ۲۳ فارسی قصیدے موجود ہیں۔ ۱۵ وہ جو مطبوعہ کلیات میں ہیں اور ۵ وہ، بعد میں جن کے عناوین بدل دیئے گئے ہیں اور ۳ وہ جو پہلی جنگ آزادی کے دوران بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ فارسی قطعات، تہنیت، مثنویاں اور مدح میں کہی گئی غزلیں اس سے الگ ہیں مثلاً ان کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے۔

شاہا بزم جشن چوشاہاں شراب خواہ　　　زر بے حساب بخش و قدح بے حساب خواہ

ڈاکٹر خلیق انجم نے دیوان غالب (اردو) میں شامل اس کلام کی تفصیل بھی دے دی ہے جو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھے گئے تھے اور اس تفصیل کے مطابق ۲ قصائد، ۵ قطعات، رباعی اور کئی غزلوں کے ممدوح (محبوب) بہادر شاہ ظفر ہیں لیکن یہی بہادر شاہ ظفر جب معتوب ہوئے تو انہوں نے نہ صرف انگریزوں کو ان سے لاتعلق ہونے کی یقین دہانی کرانے کی کوشش کی بلکہ قید میں ان کی مظلومانہ موت کے سرسری ذکر پر اکتفا کیا۔ حتیٰ کہ اپنے بھائی مرزا یوسف کے انگریزوں کے ہاتھوں قتل کو بھی فطری موت ثابت کرنے کی کوشش کی اور ان کی تجہیز و تکفین میں شریک نہیں ہوئے کہ کہیں انگریزوں سے ان کی وفاداری مشتبہ نہ ہو جائے۔[۲]

ان کے اس طرز عمل کی کوئی فلسفیانہ یا متصوفانہ اساس نہیں ہے بلکہ انہی کے قول کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ جب تک غالب کو ڈوبنے کا خطرہ نہیں تھا وہ مصری کی مکھی کی طرح بہادر شاہ ظفر کے دربار سے چپکے ہوئے تھے اور جیسے ہی انہیں محسوس ہوا کہ قلعۂ معلیٰ اور والی قلعہ معلیٰ سے وابستگی کے سبب نئے حکمراں ان سے ناراض ہیں یا ناراض ہو سکتے ہیں تو انہوں نے انگریزوں کی خوشامد کے ساتھ اپنی بے گناہی کے اظہار میں بھی شدت پیدا کر لی۔ یہی نہیں انہوں نے ایسے ممدوح بھی بنائے جو انگریزوں کے وفادار اور ان کی نگاہ میں لائق اعتبار تھے مثلاً والی رام پور نواب یوسف علی خاں ناظم.....

اگر تفصیل سے غالب کے قصائد اور ان کے ممدوحین کے حالات کا جائزہ لیں تو نتیجہ یہی

۱۔ گلِ رعنا، اسد اللہ خاں غالب (مرتبہ مالک رام)، علمی مجلس، دلی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۲

۲۔ غالب اور شاہان تیموریہ، ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۱۰۲

نکلتا ہے کہ انکی کوشش ہوتی تھی کہ ان کی ساری وفاداریاں ایسے ہی صاحبان اقتدار وثروت سے ہوں جن کے ساتھ انہیں ڈوبنے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اسی لئے

☆ وہ شہنشاہ دلی کی موجودگی میں ان کے علاوہ دوسرے نوابوں اور مہاراجوں کی شان میں بھی قصیدے کہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے انگریزوں کی قصیدہ خوانی بھی شروع کردی تھی۔

☆ ان کے متعدد قصیدے ایسے بھی ہیں جو اولاً کسی اور کی مدح میں لکھے گئے تھے لیکن بعد میں انہوں نے قدرے تغیر کے ساتھ ان کے ممدوح بدل دیئے تھے۔

☆ وہ قصیدہ لکھنے اور ممدوح کے پاس بھیجنے کے بعد خاموش نہیں بیٹھتے تھے بلکہ ممدوح کو یاد دہانی بھی کراتے تھے کہ وہ انہیں انعام سے نوازیں۔

☆ یاددہانی کے ساتھ، وہ اپنے ممدوح سے اس خواہش کا اظہار کرنے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے کہ قصیدہ کا صلہ اس قدر ملے۔

☆ قصیدوں اور خطوں میں ترمیم و تنسیخ کرنے کے ساتھ انہوں نے اپنے نسب کے اظہار میں بھی تضاد بیانی کا مظاہرہ کیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حریت پسند ہندوستانی سپاہیوں کے دلی میں داخل ہونے اور بچی کچھی مغل حکومت کے مکمل طور سے نیست ونابود ہونے سے پہلے ہی غالب کو خبر ہوگئی تھی کہ انگریزوں نے اس شرط کے ساتھ مرزا فخرو کو ولی عہد تسلیم کیا ہے کہ بادشاہ ہونے پر وہ قلعہ معلیٰ کی سکونت ترک کرکے قطب صاحب چلے جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے انگریزوں یعنی قلعہ معلیٰ کے نئے حکمرانوں سے راہ ورسم پیدا کرنے کی کوشش شروع کردی اور ۹ر نومبر ۱۸۵۵ء کو لارڈ ایلن برا کو ایک قصیدہ اس درخواست کے ساتھ روانہ کیا کہ

☆ اس قصیدہ کو ملکہ معظمہ کی خدمت میں پیش کریں

☆ ملکہ معظمہ کی طرف سے انہیں خطاب عطا ہو اور

☆ ان کی موجودہ خلعت و پنشن میں اضافہ کیا جائے۔

اس سلسلہ میں برطانیہ سے جو خط وکتابت ہوئی یا غالب کو جو باتیں معلوم ہوئیں، ان سے انہیں امید ہو چلی تھی کہ ان کے مقاصد برآئیں گے لیکن اسی دوران یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اس جنگ آزادی کی ابتداء ہوگئی جس کو انگریزوں نے شورش و بغاوت کہا ہے اور اس طرح ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ انہی کے لفظوں میں،

''۱۷ر دسمبر ۱۸۵۶ء کو لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدہ کے صلہ اور جائزہ کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ الن برا، سائل نے بھجوایا ہے خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضروری ہے۔ جو حکم صادر ہوگا سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۸۵۶ء آخر ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گذرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا''۔[۱]

انگریزوں سے خط و کتابت کے ساتھ غالب اس دوران قلعہ معلیٰ بھی جاتے رہے کیونکہ عام ہندوستانیوں کو توقع تھی کہ فتح ہندوستانیوں ہی کی ہوگی نیز اس وقت تک مختلف حیثیتوں سے غالب قلعہ معلیٰ ہی سے وابستہ تھے۔

اس کے باوجود جب انگریز برسر اقتدار آ گئے تو انہوں نے بادشاہ سے اپنے تعلق اور قصیدہ خوانی سے صریحاً انکار کیا اور یہ یقین دہانی کی کوشش کی کہ وہ انگریزوں کے بہی خواہ ہیں اور اگر شورش میں انگریزوں کی مدد نہیں کر سکے ہیں تو اس کی وجہ ان کا ضعیف و نحیف ہونا ہے۔

انگریزوں کے جاسوس گوری شنکر نے بہادر شاہ ظفر کی شان میں جو سکہ پیش کرنے کی اطلاع دی تھی غالب نے اس سے بھی انکار کیا ہے:

''سکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوقؔ نے یہ دو سکے کہہ کر گزارے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر مرحوم جو ذوقؔ کے معتقدین میں تھے، انہوں نے دلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانہ میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزارے ہوئے ثابت ہیں۔ ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبا مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا، خیر جو کچھ ہوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے اس کا گلہ کیا''۔[۲]

مالک رام نے غالب کے مندرجہ بالا بیان سے نہ صرف اتفاق کیا ہے بلکہ صادق

۱۔ غالب بنام غلام غوث خاں بے خبر، مورخہ فروری ۱۸۵۹ء

۲۔ غالب بنام چودھری عبدالغفور سرور مورخہ اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۹ء

الاخبار، دہلی' کا وہ شمارہ بھی ڈھونڈ نکالا ہے جس میں یہ سکہ شائع ہوا تھا۔[1] اس سلسلہ میں کالی داس گپتا رضا نے یہ تفصیل پیش کی ہے کہ:-

''بزر زد سکہ کشورستانی — سراج الدین بہادر شاہ ثانی

گوری شنکر جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں، جب دلی پر دیسی سپاہ کا قبضہ تھا اور انگریزی فوج شہر سے باہر پہاڑی پر ڈیرے ڈالے پڑی تھی انگریزوں کا جاسوس تھا۔ اس کے پرچے میں سچی اور سنی سنائی ہر طرح کی خبریں ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس نے ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو انگریزی کیمپ میں پرچہ بھیجا اور کہا کہ کل (۱۸ر جولائی ۱۸۵۷ء) کو غالبؔ نے مندرجۂ بالا'' سکہ زر ایک پرچہ پر لکھا۔'' غالبؔ پر سکے کے اس الزام کا وار ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب.... پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام ونشان خلعت ودربار بھی مٹا۔'' اس کا افسوس اس لئے بھی زیادہ ہوا کیونکہ واقعی یہ سکہ غالب کا کہا ہوا نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے چاروں طرف خطوں کے گھوڑے دوڑائے، دلی میں بھی، جہاں ممکن تھا بات کی مگر معلوم نہ ہوسکا کہ اس سکّے کا حقیقی مصنف کون ہے۔ یہ الزام جیتے جی غالبؔ کے دامن سے نہ دھلنا تھا نہ دھلا۔ حتّٰی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

آخر کار جناب مالک رام کے ہاتھوں، صدی پون صدی بعد، غالبؔ کو سرخروئی حاصل ہوئی۔ وہ قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی میں کام کر رہے تھے کہ وہاں انہیں صادق الاخبار (دہلی) کا ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء) کا شمارہ دستیاب ہوگیا۔ اس کے صفحۂ اول پر یہ عبارت موجود تھی:

سکہ نو طبع زاد جناب حافظ صاحب ویران شاگرد رشید استاد ذوقؔ مرحوم

بزر زد سکہ کشورستانی — سراج الدین بہادر شاہ ثانی

۱- ملاحظہ کریں: '' سکے کا الزام اور اس کی حقیقت'' مشمولہ فسانۂ غالب (دہلی ۱۹۷۷ء) مالک رام کا مضمون پہلے شائع ہوا تھا۔ کالی داس گپتا رضا نے اپنے مضمون میں مالک رام کے مضمون کی روح کو بھی سمیٹ لیا ہے۔ اس لئے یہاں انہی کے مضمون کا اقتباس دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے، گوری شنکر کی خبر قطعاً غلط تھی۔ سکہ ۱۸ جولائی تو کجا ۶ر جولائی ۱۸۵۷ء سے بھی پہلے کا کہا ہوا تھا۔

سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود حافظ ویرانؔ مصنفِ سکہ اور ذوق کے درجنوں دوسرے شاگرد وہاں دلی میں موجود تھے مگر کسی نے سچ بولنے کی ہمت نہ کی۔''[1]

اس کے باوجود غالبؔ نے انگریزوں کو جو یقین دہانی کرائی ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر چہ غالب نے بہادر شاہ ظفر کو وہ سکہ نہیں پیش کیا تھا جس کو پیش کرنے کا ان پر الزام تھا مگر ان کے قلعہ معلیٰ میں جانے اور والیِ قلعہ معلیٰ کی مدح میں کئی اور قصیدے پیش کرنے کے واقعات کی کئی دوسرے ذرائع سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے لفظوں میں:

'' ۱۴ر مئی ۱۸۵۷ء کے حالات کے تحت عبداللطیف نے ظفر کے دربار میں حاضر ہونے والے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے ان میں غالب کا نام بھی شامل ہے۔

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کے تحت جیون لال نے کئی شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے بادشاہ کی خدمت میں سکے پیش کئے تھے۔ ان میں غالب کا ذکر ہے۔

۲۶ر مئی ۱۸۵۷ء کو عید کے موقع پر غالب نے ظفر کی خدمت میں قصیدہ تہنیت پیش کیا تھا۔

۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو بقول منشی جیون لال نیز اخبار عالمتاب، آگرہ، غالب نے آگرے کی فتح کی خوشی کے موقع پر ایک قصیدہ تہنیت پیش کیا۔

۱۹ر جولائی ۱۸۵۷ء کے تحت ایک انگریزی جاسوس گوری شنکر نے لکھا ہے کہ کل اسد اللہ خاں غالب نے سکہ زر ایک پرچے پر لکھا، اور پھر یہ سکہ درج کیا ہے۔

بزر زد سکہ کشور ستانی   سراج الدین بہادر شاہ ثانی

۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کے تحت عبداللطیف لکھتے ہیں:

۱۔ اسد اللہ خاں غالب مرد، کالی داس گپتا رضا، ص ۴۔۷۳

''نجم الدولہ نواب اسداللہ خاں غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کو سنایا اور خلعت زیب تن کیا۔ غالب فارسی زبان پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن اہل فارس پر سبقت لے گئے۔''

ان تمام واقعات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ غالب اس دوران میں کئی بار دربار میں حاضر ہوئے۔ ظاہر ہے اوپر دی گئی تاریخوں کے علاوہ بھی وہ قلعے گئے ہوں گے۔ ان دنوں میں عام ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ فتح ہندوستانیوں کی ہوگی۔ اس لئے بھی غالب نے دربار سے تعلقات قائم رکھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ غالب کم سے کم اگست کے آخر تک قلعے ضرور جاتے رہے اور جب حالات بگڑنے لگے تو انہوں نے آمدورفت بند کردی۔ خاموش رہے اور پھر انہوں نے انگریزوں کی خوشامد شروع کردی۔''[1]

اور جیسا کہ پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ انگریزوں کی خوشامد کا سلسلہ تو ۱۸۵۵ء میں ہی شروع ہوگیا تھا لیکن ۱۸۵۷ء میں قوم پرستوں کی شکست کے بعد یہ خوشامد ان کی مجبوری اور ضرورت بھی بن گئی۔ ملکہ برطانیہ کے علاوہ چھوٹے چھوٹے انگریز حکام کی شان میں بھی ان کے کئی قصائد موجود ہیں۔ وہ انگریزوں کے دربار کرنے کے منتظر رہتے۔ لوگوں سے خط کے ذریعہ پوچھتے کہ کب کون انگریز حاکم کہاں دربار کررہا ہے اور پھر بن بلائے ہی وہاں پہنچ کر قصیدہ پیش کرتے۔

انگریزوں کے عتاب سے محفوظ رہنے یا وظیفہ و جاگیر کی خواہش میں انہوں نے جو بھی قصائد لکھے ہیں ان میں سب سے افسوسناک وہ قصیدہ ہے جو ملکہ برطانیہ کی شان میں لکھا گیا تھا اور جس میں انگریزوں کے اقتدار و عملداری پر بے پناہ خوشی و مسرت کا اظہار ہے:

''.... ہاں صاحب ایک بات اور ہے وہ محل غور ہے۔ میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصدہ ان دنوں لکھا ہے۔ ''تہنیت فتح اور عملداری شاہی'' ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذ مذہب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے یعنی چھاپی ہوئی ہے۔ اگر یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب

---

[1] خلیق انجم، غالب اور شاہان تیموریہ، ص ۸۲۔۸۱

کے آغاز میں شامل ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔''[1]

اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ یہ قصیدہ اصل میں بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھا گیا تھا بعد میں غالب نے اس قصیدہ میں تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کر کے اس کو ملکہ کی نذر کر دیا تھا۔ مالک رام کے لفظوں میں:

'' کلیات مطبوعہ میں اس کا عنوان ہے۔ سی ام قصیدہ در مدح شہنشاہِ انگلستان'' علیگڈھ والے مخطوطے میں اس کا عنوان یہ ہے'' در تہنیت غسل صحت حضور اقدس'' اس قصیدے کا مطلع ہے:

در روزگار ہا نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

بہادر شاہ ظفر ۱۸۵۳ء میں بہت بیمار ہو گئے تھے اور بہت دن تک بیمار رہے تھے۔ اس بیماری کے بعد غسل صحت کے موقع پر غالب نے قصیدہ کہا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ وہی قصیدہ ہو۔ چونکہ اولاً یہ قصیدہ غسل صحت کے موضوع سے متعلق تھا، اس لئے جب غالب نے اسے ملکہ وکٹوریہ سے منسوب کیا تو بعض لفظی تغیر و تبدل کے علاوہ اس میں سے وہ شعر بھی نکال ڈالے جن میں بادشاہ کی علالت اور صحتیابی کی طرف اشارہ تھا''[2]

غالب کے اس اخلاقی عیب کو عام طور پر چھپانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جن لوگوں نے اس سلسلہ میں انصاف اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے، انہوں نے حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے اپنی تحقیق میں جو انکشافات کئے ہیں وہ بہت اہم اور حیرت ناک ہیں۔

'' غالب کے متعدد قصیدے اولاً کسی کی مدح میں تھے، بعد کو قدرے تغیر کے ساتھ، ممدوح دوسرا ہو گیا، مثلاً:

کلیات کا وہ قصیدہ جس کی ردیف رفتم ہے اور جس کے قوافی پریشاں، حیراں وغیرہ ہیں، نصیر الدین حیدر اور ان کے وزیر روشن الدولہ کی مدح میں ہے، لیکن، نامہ ہائے فارسی کے ایک خط اسمی محمد علی خاں میں ہے کہ مدح معتمد

۱۔ غالب بنام حاتم علی مہر مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۸۵۹ء

۲۔ غالب اور شاہان تیموریہ، خلیق انجم۔ صفحہ ۹۰۔۸۹۔ بحوالہ مالک رام، غالب کے فارسی قصیدے، نقوش، مارچ ۱۹۳۶ء، ص ۳۲

الدولہ کا قصیدہ آپ کے پاس ہے (غالباً اس میں نصیر الدین حیدر کی بھی مدح ہوگی)، یہ میرے خاندان کے واسطے باعثِ ننگ ہے، بزرگ خرد کی غلطی کی پردہ پوشی کرتے ہیں، جب تک میں اس قصیدے میں ترمیم نہ کرلوں، اسے کسی کو نہ دکھائیں، میں چاہتا ہوں کہ اسے ہمایوں جاہ نواب مرشد آباد کو پیش کروں۔ ظاہراً اس کی کوئی صورت نہ نکلی، اور بعد کو ترمیم کے ساتھ، یہ قصیدہ اس شکل میں آ گیا جو کلیات میں ہے۔ کلیات کا ایک قصیدہ مدح ''سر چارلس تھیا فلس مٹکف''[1] میں ہے، مصرع اول'' یافت آئینۂ بختِ تو ز دولت پرداز'' نامہ ہائ فارسی کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاکنس رزیڈنٹ دہلی کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ بعد کو جب اس نے پنشن والے مقدمے میں غالب کے خلاف رپورٹ بھیجی، اور یہ تحریک کی کہ جھوٹا الزام لگانے اور فضول مقدمہ دائر کرنے کی انہیں سزا دی جائے، تو غالب اس سے متنفر ہو گئے، کلیات کا ایک قطعہ ہے جس کا مصرع اول یہ ہے ''ایا ستمزدہ غالب ز ہاکنس مسگال''

کلیات کا ایک قصیدہ وزیر محمد خاں والی ٹونک کی مدح میں ہے، لیکن بعض قلمی نسخ اس پر مشعر ہیں کہ نواب رفیع الدین خاں بہادر مخاطب بہ شمس الامراء کی مدح میں تھا، نسخۂ پٹنہ (سال اتمام کتابت ۱۲۵۷ھ کا ایک شعر ہے)

شمس الامرا کز اثر نسبت نامت   خور قبلہ بد اورنگ نشینانِ عجم را

کلیات مطبوعہ کا ایک قصیدہ مدح ملکہ وکٹوریا کا ہے جس کی بیتِ اول یہ ہے:

در روزگارہا نتواند شمار یافت   خود روزگار انچہ درین روزگار یافت

یہ دستنبو طبع اول میں بھی شامل ہے، اور جس زمانے میں یہ رسالہ چھپ رہا تھا یا اس کی طباعت کا آگرہ میں نظم ہو رہا تھا، غالب نے لکھا تھا کہ ان دنوں ایک قصیدہ مدح ملکہ میں موزوں ہوا ہے، اسے دستنبو کے ساتھ چھپنا چاہئے۔ یہ قصیدہ جیسا کہ بعض مجموعۂ اشعار غالب سے ثابت ہے، انطباع دستنبو سے کئی سال قبل اس موقع پر کہا گیا تھا جب بہادر شاہ نے ایک سخت مرض میں مبتلا ہو کر غسلِ صحت کیا تھا۔

کلیات کا ایک قصیدہ مدح مہاراجہ الور میں ہے، مصرع اول ''گرد

---

[1] سر چارلس مٹکاف ہونا چاہئے۔

آورد بشکل فرس بادِ را بہار' یہ دراصل لارڈ ہارڈنگ کی آمد دہلی کے موقع پر کہا گیا تھا۔

کلیات کا قصیدہ مدح وکٹوریا'' شکر کہ آشوب برف و بادسر آمد النح''
اصل میں مرزا غلام فخر الدین ولیعہد بہادر شاہ کی ستائش میں تھا۔

ان قصیدوں کے متعلق تو ثابت ہے کہ ان کے اولین ممدوح وہ نہیں جو کلیاتِ مطبوعہ میں نظر آتے ہیں، بخوبی ممکن ہے کہ ایسے اور قصائد بھی ہوں۔ باغ دودر کے ایک خط میں ہے کہ امجد علی شاہ کی مدح کا قصیدہ کلیات میں ہے جو دور دور پہنچ چکا ہے اور لوگوں کی نظروں سے گزر چکا ہے، یہ ننگ کس طرح گوارا کروں کہ اس کا ممدوح بدل دوں، یہ دولتِ دنیا نہیں جو میری دسترس سے باہر ہے، یہ شعر ہے جو'' گنج در گنج'' مجھے مبدء فیاض سے ملا ہے، دوسرا قصیدہ لکھوں گا، مگر کوئی قصیدہ اگر کسی ایک شخص کے نام طبع نہیں ہوا، اس سے قطع نظر کہ کسی خطی نسخے میں وہ کس طور پر ہے، انہیں اسے کسی اور کے نام کر دینے میں تامل نہ تھا۔ صرف ایک قصیدہ ہے جس کی نسبت ان کا صحیح اعتراف موجود ہے کہ پہلا ممدوح کوئی اور شخص تھا۔ ایک خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں'' جہاں پناہ (واجد علی شاہ) کی مدح کی فکر نہ کر سکا، یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا، میں نے اسی میں امجد علی شاہ (پدر واجد علی شاہ) کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھا دیا، خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے... میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت'' ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ کون سا قصیدہ ہے، غالب نے قطب الدولہ کی وساطت سے جو قصیدہ بھیجا تھا اس کی ردیف اس سے قطع نظر کہ ممدوحین کے بدل جانے سے قصیدوں میں ترمیم کرنی پڑی ہے، ان کے منظومات میں اور وجوہ سے بھی تغیر ہوتا رہا ہے مثلاً وہ مثنوی جو کلیات میں بادِ مخالف کے نام سے مندرج ہے، اس کا اصلی نام آشتینامہ تھا، اور اس کی وہ روایت جو کلکتہ میں پیش ہوئی تھی، کلیات کی روایت سے بہت مختلف ہے، اختلافات سے مفصل بحث میں نے اپنے ایک مقالے میں کی تھی جو مسلم ریسرچ ایسوسی ایشن میسلنی میں شائع ہوا تھا۔ پہلی روایت میں بھی ایسے اشعار تھے، جو اس شخص کی زبان سے جو مخالفین کی

دلجوئی چاہتا ہو، مناسب نہ تھے، لیکن روایتِ آخر میں تو مخالفت اور نمایاں ہو گئی ہے۔

غالب نے لکھنؤ میں ایک غزل کہی تھی، ردیف کو، قوافی، ہم، سم وغیرہ، اس میں معتمد الدولہ کا نام آیا تھا، مروجہ دیوان سے وہ شعر ہی نکال دیا گیا جس میں نام تھا۔ ابھی چند ماہ ہوئے غالب کے دیوان اردو کا ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے جو نسخہ بھوپال سے بھی قدیم تر ہے۔ اس کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ اس پر مشعر ہیں کہ نسخۂ امروہہ و نسخہ بھوپال کا مشترک کلام لازماً ایک طور پر نہیں۔ "[1]

اس تحقیق سے جو غالب کے اعترافات پر مبنی ہے، یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ غالب نے ایک کا قصیدہ دوسرے سے منسوب کرنے کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی تاویل بھی کی ہے قصیدوں کے علاوہ دوسری تحریروں میں بھی غالب کا یہ عیب موجود ہے اور قاضی عبدالودود نے اس کی بھی نشاندہی کی ہے:

"غالب کسی امر کے متعلق تخمینی طور پر ایک سے زیادہ مقامات میں کچھ لکھتے ہیں تو ان کے بیانات متفاوت ہوتے ہیں۔ جناب عرشی نے اپنے مرتبہ دیوان اور مقدمہ مکاتیب غالب میں آغاز شعر گوئی اور یوسف علی خاں سے تعلقات کی ابتداء کے بارے میں ان کے مختلف اقوال جمع کر دیے ہیں۔ انسان کسے قبول کرے اور کسے رد۔ ان کا ایک بیان بھی اس قسم کا ہو تو لازماً صحیح نہیں مثلاً کلکتہ جانے کا سنہ ۱۸۳۰ لکھا ہے"[2]

'ستائش' اور 'صلے' کی تمنا سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ کرنے والے غالب کی حقیقی زندگی، ان کے دعوے سے کتنی مختلف تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ممدوح بدلنے، ستائش و صلہ کی تمنا میں قصیدہ لکھنے، ایک کا قصیدہ دوسرے سے منسوب کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ "صلہ" نہ ملنے پر ممدوح کو یاد دہانی بھی کرایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے لفظوں میں:

"حالی نے "یادگارِ غالب" میں غالبؔ کے ایک قطعے کا ذکر کیا ہے جو کلیات میں موجود نہیں ہے وہ انہیں غالبؔ کے خانگی کاغذوں میں ملا تھا۔

۱۔ قاضی عبدالودود، مقالہ افتتاحیہ، بین الاقوامی غالب سمینار دلی ۱۹۶۹ء ص ۲۹

۲۔ قاضی عبدالودود، مقالہ افتتاحیہ، بین الاقوامی غالب سمینار، دلی ۱۹۶۹ء ص ۲۹

غالب نے کسی امیر کو قصیدہ بھیجا تھا جس کا عرصے تک کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ یہ قطعہ اس کی یاد دہانی کے طور پر لکھا گیا تھا۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ" میں نے عقل سے پوچھا کہ نواب نے جواب نہیں بھیجا، نہ جانے میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں لکھ دی جس پر نواب کی آزردگی ہوئی۔ عقل نے کہا کہ کیوں گھبراتے ہو، نواب جس ساز و سامان کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہوسکتا۔ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے سانڈنی، اصفہان سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت، یہ سب چیزیں فراہم کر کے لائیں، تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ جس عقل نے مجھ کو یہ دم دیا تو میری یاس و ناامیدی، امید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لئے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اس کیلئے آئینہ اور تاج سکندر سے، انگشتری اور تخت سلیمان سے، عالمِ غیب سے جامِ جمشید، چشمۂ خضر سے عمر ابد، نشاطِ جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے، اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں۔"[1]

یہ قطعہ "سبد چیں" میں موجود ہے اور لطف کے لئے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

گفتم بخرد بخلوتِ آنس — کای شمع و چراغ ہفت ایوان

آیا زچہ روبود کہ نواب — ننوشت جواب نمہ ام ہان

آں گونہ عریضۂ کہ دانی — درویش نوشتہ سوے سلطان

آں گونہ قصیدۂ کہ گوی — از صفحہ دمیدہ سنبلستان

ایں ہر دو رسید و نیست پیدا — زانسو اثری بہیچ عنوان

رنجید مگر زمدحِ نواب — اے کاش نگشتمی ثناخوان

ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم — از گفتۂ خویشتن پشیمان

---

[1] ا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ غالب کے کلام میں حرکی (ڈائنے مک) تصورات۔ بین الاقوامی غالب سمینار، دلی ۱۹۶۹ء ص ۷۔۱۰۶

عقلم بجواب گفت غالبؔ زنہار مخور فریب شیطان
نواب بفکر ارمغان است تا نامہ فرستدت بسامان
وانہا کہ بخاطرش گزشتست زود آں ہمہ جمع کرد نتوان
زود است کہ جمع نیز گردد دیر است کہ دادہ است فرمان
تا راہ روانِ بحر و بر گرد آرند بکوششِ فرادان
دیباز دمشق و مخمل از روم الماس زمعدن و زراز کان
فیل از دکن و زمرد از کوہ توسن زعراق و در زعمان
فیروزۂ نغز از نشاپور یاقوتِ گزیدہ از بدخشان
جمازۂ تیز رو زبغداد شمشیر برندہ از صفاہان
پشمینۂ قیمتی ز کشمیر زربفت گراں بہا ز ایران
بالجملہ درنگ چوں ازیں روست بر رنج و ملال نیست برہان
چوں پیر خرد بدل فریبی گفت ایں ہمہ راز ہائے پنہان
گشتم بہ دمِ امید داری مرہم نہ زخم یاس و حرمان
گفتم کہ چو با من ایں کرم کرد آں قبلہ و قبلہ گاہِ ایمان
ناچار ز راہِ حق گذاری تا کردہ شود تلافیٔ آن
من نیز طلب کنم برایش این خواہش اگرچہ نیست آسان
آئینہ و تاج از سکندر انگشتر وتخت از سلیمان
از عالمِ غیب جامِ جمشید از چشمۂ خضر آبِ حیوان
عمرِ ابد و نشاط جاوید نیروی دل و ثبات ایمان
توفیق جواب نامۂ خویش توقیع عطا و بذل احسان

غالب صلہ کے لئے یاد دہانی تو کراتے ہی تھے، ممدوح کو یہ لکھنے میں بھی تردد محسوس نہیں کرتے تھے کہ صلہ کم از کم اتنا ہو۔ قاضی عبدالودود نے اس سلسلہ میں انہیں کے خط کو ثبوت کے طور پر پیش کر کے اس پر گرفت کی ہے:

"غالب کے ایک خاص شاگرد میکش کی رسائی لکھنؤ میں قطب الدولہ کے یہاں ہوگئی، غالب کو اس کا امکان نظر آیا کہ قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علی شاہ کی خدمت میں قصیدہ پیش کر کے صلہ وصول کیا جائے۔ مگر وہ چاہتے

تھے کہ کم از کم ۵ ہزار ملیں ، چونکہ خود صلے کی رقم مقرر کردینا دستور نہیں ، انہوں نے یہ دکھانا چاہا کہ یہ دربار اودھ کا معمول ہے کہ مجھے قصیدے کا صلہ اس قدر ملے ۔نصیر الدین حیدر کی مدح کے قصیدے کی نسبت قطب الدولہ کو لکھتے ہیں .. '' از عہد اورنگ نشینی نصیر الدین حیدر .. بصیغۂ صلۂ مدح زلہ خوار خوان عطای آن سلطنتم ۔قصیدہ ممن بوساطت روشن الدولہ بہ پیش گہہ سلطان .. گذشتہ و پنجہزار روپیہ مرحمت گشتہ'' اس کے صراحتہً یہ معنی نکلتے ہیں کہ غالب نے صلہ پایا، ورنہ '' زلہ خوار خوانِ عطا'' مہمل ہوجاتا ہے ۔صلہ یابی کی امید منقطع ہونے لگی تو غالب نے عالمِ یاس میں میکش کو لکھا کہ میری یہ قسمت کہاں کہ صلہ ملے'' نصیر الدین حیدر مدح شنید و زر بخشید ، روشن الدولہ و منشی محمد حسن پاک بخوردند و پشیزی بمن نرسید'' لیکن یہ بھی داستان محض ہے، نصیر الدین حیدر تک قصیدہ پہنچا ہی نہیں ، اس صورت میں صلے کا کیا سوال ہے ۔کلیات کے ایک سے زیادہ قدیم نسخوں میں قصیدۂ مذکور کا عنوان یہ ہے:'' نگارش پذیرفتن مدح شاہ اودھ در جریدہ و بورق یادگار ماندن مدح بممدوح نارسیدۂ از عالم مستی بوی بادۂ ناکشیدہ'' اس داستان میں بعد کو غالب نے یہ اضافہ کیا کہ اس سلسلے میں ناسخ سے مراسلت ہوئی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ روشن الدولہ کے حلق سے روپیہ نکال لیں گے، مگر اسے کیا کیجئے کہ اس کے بعد ہی نصیر الدین حیدر فوت ہوگئے ۔غالب یہ بھی فراموش کر گئے کہ عہد روشن الدولہ میں ناسخ کا وہ اثر نہ تھا کہ ایسا وعدہ کر سکتے ۔''[۱]

اپنی تحریروں میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہنا قلمکاروں کا معمول ہوتا ہے اور یہ کوئی عیب نہیں ہے لیکن بھیجے ہوئے خطوط میں ردو بدل کرنا یا اپنے نسب کے اظہار میں تضاد بیانی کا مظاہرہ کرنا، نہ صرف عیب بلکہ ایسا عیب ہے جو عذرِ گناہ سے اور زیادہ قبیح ہوجاتا ہے ۔غالب کے خطوط میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے نسب کے متعلق ان کی تضاد بیانی کا سراغ لگتا ہے۔

'' غالب نے پہلے اپنے کو ترک ایبک افراسیابی النسل کہا اور بغیر اس کے کہ اس کی تردید کریں، سلجوقیوں کو ہمگوہر کا دعویٰ کیا، اس کے بعد اپنے کو سلجوقی کہا، اور بالآخر سنجر و برکیارق کی اولاد ہونے کے مدعی ہوئے ۔غالب

۱۔قاضی عبدالودود، مقالہ افتتاحیہ، بین الاقوامی غالب سیمینار ۶۹ء ص ۲۸۔۲۷

نے بتایا کہ ایبک ترکوں کا ایک قبیلہ تھا اور حالی نے نیّر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہند
میں فارسی شاعری کا آغاز ایک ترک لاچین امیر خسرو سے ہوا، اور خاتمہ ایک
ترک ایبک، غالب پر ہوا، مگر غالب ونیّر وحالی یہ سب اس سے بے خبر ہیں کہ
اس نام کا کوئی قبیلہ تھا ہی نہیں۔ ہمکوہری سے اس کا انکار لازم آتا ہے کہ سلجوقی
تھے، اور سلجوقی نہ تھے تو سنجر و برکیارق کی نسل سے بھی نہ تھے، مزید یہ کہ یہ دونوں
ملک شاہ کے بیٹے ہیں، ان دونوں کی اولاد سے ہونا کیا معنی؟ ڈاکٹر یوسف
حسین کے اس خیال سے مجھے اتفاق ہے کہ غالب اوزبک تھے۔ ہند میں اس
کے ساتھ خوشگوار تصورات وابستہ نہیں، ذہن ایبک کی طرف گیا، جو اور کچھ نہیں
تو اس کا قافیہ ہوسکتا تھا۔''[1]

''غالب نے اپنے دادا کے متعلق لکھا ہے کہ معین الملک کے عہد میں
ہند آئے اور یہ بھی کہ شاہ عالم کے زمانے میں آنا ہوا، دونوں باتیں صحیح نہیں
ہوسکتیں۔''[2]

ان تمام اقتباسات وواقعات کو پڑھنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ غالب کے بارے
میں بہت سارے حقائق کو قصداً چھپانے اور ان کی شخصیت کو غلط طور پر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے اور بعض
معاملات میں خود غالب بھی غلط فہمی پھیلانے والوں میں شریک رہے ہیں۔ اگر ان کی شخصیت پر لکھتے
وقت، خوشگوار و ناخوشگوار تمام واقعات قلمبند کردیے جاتے تو ان کی شہرت یا شاعرانہ حیثیت میں کمی نہ ہوتی
بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا کہ غالب جتنے عظیم شاعر تھے اتنے عظیم انسان نہیں تھے۔

آل احمد سرور نے اس حقیقت کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا ہے بلکہ اس کے اظہار میں
جرأت کے ساتھ عالمانہ دیانت وجزرسی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔

''یہ غلط ہے کہ ہر بڑا یا اچھا شاعر بڑا یا اچھا آدمی بھی ہوتا ہے۔ غالب
آدمی تھے انسان نہ تھے۔ ان کی زندگی خاصی رنگ رلیوں میں گزری۔ انہوں نے
اس بات کو کبھی چھپایا نہیں۔ وہ مذہبی آدمی نہ تھے دنیادار آدمی تھے مگر وہ مذہب کی
روح سے آشنا تھے اور اس نے انہیں ایک رواداری اور وسیع المشربی اور انسان
دوستی عطا کی تھی۔ وہ اچھے دوست تھے۔ اچھے دشمن نہیں تھے۔ وہ خاصے خودغرض

۱۔ اس سلسلے میں پروفیسر نذیر احمد کی کتاب ''غالب پر چند تحقیقی مطالعے'' (دہلی ۱۹۹۶ء) دیکھی جاسکتی ہے۔
۲۔ قاضی عبدالودود، مقالہ افتتاحیہ، بین الاقوامی غالب سمینار ۱۹۶۹ء ص ۳۲

آدمی تھے۔ وہ اپنے سرپرستوں کی خاصی خوشامد بھی کر لیتے تھے۔ وہ جاگیردارانہ دور کی بخشی ہوئی اقدار کے مطابق رئیسانہ شان سے زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، وہ دوستوں اور شاگردوں سے مدد مانگنے میں عار نہیں سمجھتے تھے مگر انہوں نے اپنے فن کو کبھی ذلیل نہیں کیا۔ قصائد میں بھی تشبیب کو مدح سے زیادہ اہمیت دی۔ فن کی وجہ سے فن کار عزیز اور محترم ہونا چاہئے۔ فن کار کی وجہ سے فن نہیں۔

غالب کی اردو شاعری اور غالب کے اردو خطوط، ایک بڑی اور بیدار شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ شاعری میں غالب کی فکر کا وہ رقص نظر آتا ہے جو آنسوئے افلاک تک جا سکتی ہے۔ غالب کے خطوط میں وہ آدمی نظر تا ہے جو اس فکر کی وجہ سے تنہائی محسوس کرتا ہے اور اس تنہائی کو دور کرنے کے لئے اپنے گرد ایک انجمن بنالیتا ہے۔ غالب کے مکتوب الیہ غالب کے خطوں کو بڑا عزیز رکھتے تھے۔ مگر یہ بات بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ غالب یہ خط کیوں لکھتے تھے اور کس طرح خطوں میں باتیں کرنا ان کے لئے ضروری تھا۔ جوں جوں آنسوئے افلاک کی سیر کا ولولہ ماند پڑتا گیا، یہ خطوں کے ذریعہ سے انجمن سازی اہم ہوتی گئی اور ذہن کی شوخی نے جہانِ معنی کے علاوہ خلوت کی آبادکاری کو بھی اپنا شغل بنالیا۔[1]

اس مضمون میں آل احمد سرور نے جرمن شاعر ہائینے کے حوالے سے ایک اور بہت اہم بات کہی ہے۔

"مشہور جرمن شاعر ہائینے نے ایک بڑے پتے کی بات جرمن غنائیوں اور رومانوں کے متعلق کہی ہے کہ وہ اپنی سحر کاری کے باوجود اس دور کے جاگیردارانہ رجعت پسند سماج کی آواز ہیں۔ اسلئے جدید ذہن شاعر کے یہاں شاعری دیکھتا ہے۔ اس کے نظریے، فلسفے، آئیڈیالوجی، اس کے دائیں بازو یا بائیں بازو میں شرکت کی بنا پر اس کا درجہ متعین نہیں کرتا۔ غالب کی عظمت کو منوانے کے لئے انہیں مفکر یا صوفی یا ہندوستان کی جنگ آزادی کا مجاہد ثابت کرنا قطعاً ضروری نہیں۔ غالب نے اگر انگریزوں سے دوستی کی یا دلی کی بربادی پر کوئی مرثیہ حالی، یا داغ، یا ظہیر دہلوی کی طرح نہیں لکھا تو اس سے غالب کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شاعر شہری بھی ہوتا ہے، شہری کی حیثیت سے اس کے کچھ فرائض بھی ہوتے ہیں۔ شہری کو، جب گھر میں آگ لگے، تو اسے بجھانا

۱۔ آل احمد سرور، غالب اور جدید ذہن، علی گڑھ میگزین، ص ۹۔ ۱۰

چاہئے یا آگ بجھانے کیلئے اپنی تقریر یا تحریر سے دوسرے شہریوں کو متوجہ کرنا چاہئے ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شہر کی آگ دل کی آگ بن جائے اور اس صورت میں شعر بھی لو دینے لگیں مگر ایسا نہ ہو تو شاعر کو مطعون کرنے کی کوئی وجہ نہیں ۔ غالب نے اپنے خطوں میں دلی کی بربادی کی جو تصویر کھینچی ہے وہ دلی کے تمام مرثیوں پر بھاری ہے ۔ مگر غالب کی دوربیں نظر صرف شمع کشتہ کے ماتم میں مصروف نہ رہ سکتی تھی ۔ وہ ایک نئی بساط کی تیاری کو بھی دیکھ سکتی اور دکھا سکتی تھی ۔''[1]

غالب بھی اپنے زمانہ کی جاگیردارانہ رجعت پسند سماج کے اس طبقہ کی آواز تھے جو نہ صرف اپنے لئے جیتا ہے بلکہ اپنے مفاد کے لئے قومی غیرت و مفاد کو بھی قربان کر دیتا ہے ۔ ان کو اس حقیقت کا تو احساس تھا کہ ہر دور اپنا آئین خود مرتب کرتا ہے ۔ مغل ماضی ، قصہ ماضی بن جانے والا ہے اور ملک کا مستقبل انگریزوں کے ہاتھ میں ہے لیکن اس بات کا احساس نہیں تھا کہ برطانوی اقتدار کے استحکام کے ساتھ ان کے خلاف انفرادی طور پر جو نفرت پیدا ہو رہی ہے وہ آئندہ ایسی قومی تحریک کی صورت میں ابھرنے والی ہے جو کسی کے دبائے نہ دبے گی ۔

جہاں تک شہر کی آگ کے غالب کے دل کی آگ بننے کے دعوے کا تعلق ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ ۵۷ کے بعد غالب کم و بیش ۱۲ سال زندہ رہے اور ان ۱۲ برسوں میں انہوں نے جو اشعار کہے وہ تعداد کے اعتبار سے بہت کم اور معیار کے اعتبار سے ان کے پچھلے کلام سے کم تر ہیں ۔[2]

غالب اپنی شاعری کی روشنی میں (جو ۱۸۵۷ء سے پہلے کی ہے) ایک ایسے شخص نظر آتے ہیں جن کی طبیعت میں انکار ، آزادی اور احتجاج کی ایک فطری لہر موجود تھی جس کو وہ کسی مجبوری و مصلحت کے سبب دباتے بھی نہیں تھے لیکن اپنے قصیدوں میں وہ ہمہ گیر انقلابات سے دوچار زمانہ کے گرداب میں اپنی ہستی کا تماشہ دیکھنے ، کبھی زمانہ پر اور کبھی زمانہ کے ہاتھوں اپنی ہستی کے حشر پر ہنسنے والے عظیم شاعر نظر نہیں آتے ۔ بلکہ معمولی درجے کے دنیادار اور خوشامدی آدمی نظر آتے ہیں جو اپنی ضرورتوں کے مطابق نئے ممدوح بھی تلاش کرتا ہے اور مدح کے نئے انداز بھی لیکن مدح کے ہر لفظ کی قیمت چاہتا ہے اور یہ قیمت اگر وہاں نہیں ملتی جہاں ملنی چاہئے تو وہ بلا تکلف اس مدح کو کسی اور پر خرچ کر کے معاوضہ طلب کرتا ہے ۔

☆☆☆

---

۱ ۔ آل احمد سرور ۔ غالب اور جدید ذہن علی گڑھ میگزین

۲ ۔ ملاحظہ کریں : غالب کے خطوط بنام سرور ۱۸۵۹ء ، بنام علائی ۱۸۶۰ء اور دوسرے خطوط ۔ تفتہ کے نام ۔ ۱۱ اپریل ۱۸۵۸ء کے خط میں انہوں نے لکھا ہے : '' اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا ۔''

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

عظیم غالبؔ کے ذہن کی جدت و وسعت اور اسلوب کی ندرت وقوت کے مکمل اعتراف کے باوجود یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ ۱۸۵۷ء کے المناک واقعات وحوادث ان کے شعری تجربوں میں ڈھل سکے ۔ اکثر شارحین [۱] غالبؔ نے جن شعروں کو ۱۸۵۷ء میں بدیسی حملہ آوروں اور حکمرانوں کے خلاف ہندوستانیوں کی مسلح مزاحمت اور اس کی ناکامی کے بعد کے قیامت خیز حالات پر منطبق کرنے کی کوششیں کی ہیں وہ تمام اشعار ۱۸۵۷ء کے بہت پہلے کے ہیں اور دیوان غالب کے کسی نہ کسی مطبوعہ نسخہ یا بیاض [۲] میں موجود ہیں ۔ زیادہ تر اشعار ۳۵ تا ۴۱ سال پہلے کے ہیں ۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے عرق ریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تمام اشعار کی نشاندہی کردی ہے جو غلطی سے ۱۸۵۷ء کے واقعات وحالات کے تاثر و تجربہ کا نتیجہ سمجھ لئے گئے ہیں ۔ [۳]

اس مضمون کا عنوان غالب کی جس مشہور زمانہ غزل سے ماخوذ ہے اس کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا رہا ہے کہ 'فتح دلی' کے بعد انگریزوں نے جب یہاں کے لوگوں پر سخت ترین مظالم ڈھائے اور ان کی تہذیبی شناخت کو مٹانے کی کوششیں کیں تب یہ غزل کہی گئی ۔ ان کی نظر میں یہ غزل دلی کی عظمتِ رفتہ کا مرثیہ اور مغلوں یا شاہانِ تیموریہ کے اقبال گزشتہ کا نوحہ ہے جو بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد کہا گیا حالانکہ یہ پوری غزل نسخہ شیرانی ۱۸۲۶ء میں موجود ہے ۔

کالی داس گپتا رضا نے اس کو بعد از ۱۸۲۶ء کی تخلیق [۴] بتایا ہے ۔ دونوں ہی صورتوں میں

۱۔ (الف) ڈاکٹر سید محمود ۔ اردو دیوان غالب مع شرح نظامی ، بدایوں ، ۱۹۲۰ء

ڈاکٹر سید محمود نے سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں دیوان غالب (نظامی ایڈیشن) پر ایک مقدمہ لکھا تھا ۔ جو تیسرے ایڈیشن (۱۹۲۰ء) پہلی بار شائع ہوا ۔ ۱۹۳۱ء میں اس پر نظر ثانی کر کے انہوں نے اس کو مزید دلچسپ بنایا ۔

(ب) مولانا غلام رسول مہر ، ماہ نو ، کراچی ، فروری ۱۹۵۳ء ص ۳

(ج) ابو سلمان شاہجہاں پوری ، العلم ، کراچی ، جنوری ، مارچ ۱۹۶۹ء ص ۱۰۵

(د) بابائے اردو مولوی عبدالحق ، ہم قلم کراچی ، اگست ۱۹۶۲ء ص ۹۶

۲۔ بیاض غالب (۱۸۱۶) نسخہ حمیدیہ (۱۸۲۱) نسخہ شیرانی (۱۸۲۶) نسخہ عرشی زادہ (۱۹۶۹)

۳۔ غالب اور انقلاب ستاون ۔ ۱۹۸۸ء ص ۳۰۸ تا ۳۲۴

۴۔ دیوانِ غالب کامل ، تاریخی ترتیب سے ص ۳۷۴

یہ ۱۸۵۷ء یا بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور جلا وطنی کہ تاجپوشی (۱۸۳۷ء) سے بہت پہلے کی ہے اور اس کا ۱۸۵۷ء کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۸۵۷ء کی قیامت صغریٰ کے بعد غالب کم وبیش ۱۲ برس زندہ رہے اور اس دوران،

☆ یہی نہیں کہ انہوں نے بہت کم اشعار کہے بلکہ

☆ جو اشعار کہے ان میں سے بیشتر فکر واسلوب اور معیار وتاثیر کے اعتبار سے ۱۸۵۷ء سے پہلے کہے ہوئے شعروں کے مقابلے میں کم تر ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء ہندوستان کی قومی اور سیاسی زندگی کے لئے ہی نہیں، ادبی اور تہذیبی زندگی کے لئے بھی ایک ایسا قہر ثابت ہوا جس نے غالب سے، جو زندگی اور فلسفۂ زندگی کے شاعر تسلیم کئے گئے ہیں اور جنہیں اصرار تھا کہ

شعر غالب نہ بود وحی ونہ گوئیم ولے
تو ویزداں نتواں گفت کہ الہامے ہست

یا

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

شاعرانہ احساس اور اس کے فنکارانہ اظہار کی قدرت چھین لی اور وہ اپنے ہی ایک مصرعہ کی جیتی جاگتی تصویر بن کر رہ گئے کہ ع اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اس وقت غالب کی عمر ۶۱ برس رہی ہوگی۔ اس کے بعد وہ جتنے سال بھی جیئے ان کی زیادہ تر توجہ نثر، وہ بھی فارسی نثر پر رہی لیکن جو نثر انہوں نے بڑی محنت اور توجہ سے لکھی تھی (دستنبو) اس کے مقابلے اس نثر کو زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ شاید ہی کوئی پرچہ دل لگا کر لکھا ہو۔ ۱۸۵۷ء کے بعد فارسی نثر میں غالب کی دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک دستنبو (۱۸۵۸ء) اور دوسری قاطع برہان (۱۸۶۲)۔ 'قاطع برہان' ہی کی دوسری اشاعت معمولی ردوبدل کے ساتھ 'درفش کاویانی' کے اضافی نام کے ساتھ (۱۸۶۵) میں ہوئی۔

غالب کی اردو نثر کی تمام کتابیں ۱۸۵۷ء کے بعد شائع ہوئیں۔ لطائف غیبی (۱۸۶۴ء) نامۂ غالب (۱۸۶۵) سوالات عبدالکریم (۱۸۶۵) اور تیغ تیز (۱۸۶۸ء) تو لکھی بھی گئی ۱۸۵۷ء کے بعد۔ خطوط کے بارے میں دیکھئے اس کتاب کا آخری باب۔

فارسی خطوط میں نامانوس الفاظ اور استعارات کی کثرت نے قاری کے لئے ترسیل کے

مسائل پیدا کر دیے ہیں جبکہ اردو خطوط، ایک نئے اسلوب کی بنیاد بننے کے ساتھ غالب کی نجی زندگی کی شکستوں، ہزیمتوں، عیوب اور تصادموں کے علاوہ ان کے عہد کے تہذیبی، اخلاقی، معاشی سیاسی بحران اور بندگانِ خدا پر ان کے اثرات کا کسی حد تک حوالہ بن گئے ہیں (حالانکہ انہوں نے بہت سے حوالے حذف کر دیے ہیں یا قصداً بہت سے حقائق کی ان دیکھی کی ہے) لیکن اس دوران کہے گئے اشعار ان خوبیوں سے قطعی عاری ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ انیسویں صدی کے ہندوستانی شاعروں میں غالب کے سوا کوئی ایسا شاعر نہیں گزرا جو دنیا کے بڑے شاعروں کی ہم سری یا رفاقت کا دعویٰ کر سکے۔ ان کے ہم عصروں میں فرانس کا بودلیئر (۱۸۲۱-۱۸۶۷)، جرمنی کا ہائنے (۱۸۵۶-۱۸۹۷)، امریکہ کا والٹ وہٹ مین (۱۸۱۹-۱۸۹۲)، برطانیہ کا ولیم ورڈس ورتھ (۱۸۵۰-۱۸۷۰)، شیلے (۱۸۲۲-۱۷۹۲)، کیٹس (۱۸۲۱-۱۷۹۵) اور روس کا پشکن (۱۸۳۷-۱۷۹۷) ہے لیکن خود غالب کے کلام میں معنی کی جتنی پرتیں، تجربہ کی جتنی جہتیں اور انسان کی بدلتی ہوئی صورت حال کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کی جتنی حقیقتیں ہیں، وہ ان تمام شاعروں کے ہوتے ہوئے غالب کو انیسویں صدی کی تخلیقی بلندی کا اہم نشان بنا دیتی ہیں۔

لیکن یہ تخلیقی بلندی جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے بیشتر ان شعروں میں ہے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے یعنی انیسویں صدی کے نصف اوّل میں کہے گئے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد شعر گوئی پر زوال کے سلسلہ میں خود غالب کے اعترافات موجود ہیں:

(۱) ”.... میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے شعر سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے۔ تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آ جاتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے[1]

(۲) ..... اشعار تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے

۱۔ مرزا ہرگوپال تفتہ جون یا جولائی ۱۸۵۸ء

مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا، خلعت موقوف، بھئی متروک، نہ غزل، نہ مدح ہزل و ہجو میرا آئین نہیں، پھر کہو کیا لکھوں....''[1]

(۳)..... شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی...''[2]

(۴)..... اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار...''[3]

(۵)''..... سبحان اللہ تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرع موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو''[4]

(۶)''..... بعد عذر ذوق شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا۔ دو تین غزلیں فارسی ہندی لکھی ہیں ان کا انتخاب بھی پہنچے گا'' [5]

ان اعترافات کی روشنی میں یہ حقیقت تو پایۂ تکمیل کو پہنچ ہی جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب کی شعر گوئی پر زوال آ گیا، ماہرین غالبیات نے غالب کے شعروں کے زمانۂ فکر کا سراغ لگا کر ان اشعار کی بھی نشاندہی کر دی ہے جو ان کی زندگی کے آخری ۱۲ برسوں میں کہے گئے ہیں۔

کالی داس گپتا رضا کے ترتیب دیئے ہوئے دیوانِ غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) میں غالب کا اب تک کا دستیاب تمام کلام شامل ہے اور قطع نظر اس سے کہ غالب نے اپنی زندگی میں جن اشعار کو اپنے دیوان میں شامل نہیں کیا، اس کو بعد والوں نے کیوں جمع کرنے کی سعی کی؟ اب ۱۸۵۷ء کے بعد کے کلام غالب کے متعلق اندازہ کرنے یا پہیلی بوجھنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ اس کی پوری تفصیل یہ ہے۔

۱۱/قطعات

۹/غزلیں

۴/قصائد

۱۔ بنام نواب علاء الدین احمد خاں علائی، ۲/جولائی ۱۸۶۰ء

۲۔ بنام چودھری عبدالغفور سرور اگست یا ستمبر ۱۸۵۹ء

۳۔ بنام منشی ہرگوپال تفتہ ۱۸۶۷ء (اس خط کی تاریخ کا تعیین بہت مشکل ہے) کہیں ۱۸۶۳ء بھی لکھا ہے۔

۴۔ بنام منشی ہرگوپال تفتہ ستمبر ۱۸۶۱ء

۵۔ بنام کلب علی خاں۔ ۱۰/ستمبر ۱۸۶۶ء

۱ر سہرا (دو شعر)

۱ر مرثیہ (تین بند)

۳رر باعیات

۱ر مثنوی (تین شعر)

۱۸۵۷ء کے بعد کے کلام غالب کی یہ تفصیل غالب کے اعترافات یا شیخ محمد اکرام اور مولانا غلام رسول مہر کے بیانات کے مقابلے میں اگر چہ بہت زیادہ ہے۔اس کے باوجود ان کی یومیہ تخلیق کا اوسط ڈیڑھ پونے دو شعر سے زیادہ کا نہیں ہے اور یہ ڈیڑھ پونے دو شعر بھی ایسے نہیں ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکے کہ ان سے اردو شاعری کے معنوی حجم میں توسیع ہوئی ہے۔شاید اسی لئے غالب کی زندگی میں جو دیوان شائع ہوا تھا اس میں بعد از کلام ۱۸۵۷ء سے صرف ٦ شعر شامل کئے گئے تھے۔غالب نے اپنا جو کلام رد کر دیا تھا اس میں سے بیشتر اشعار نہ صرف غیر معیاری ہیں بلکہ ان میں وہ غالب ہی نہیں ہیں جن کا دعویٰ تھا کہ

گنجینہ ٔ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

البتہ ۱۸۵۷ء کے پہلے کے جو اشعار غالب کے دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ان میں بعض اشعار بہت با معنی ہیں۔

یعنی ۱۸۵۷ء نے ہندوستان اور ہندوستانیوں سے جہاں بہت کچھ چھین لیا، وہاں نابغہ ٔ روزگار غالب سے شعری وفنی قوت وصلاحیت بھی چھین لی جس کا اعتراف ان کے خطوط میں موجود ہے۔البتہ اس اعتراف میں شعر گوئی پر زوال کی اصل وجوہ کا ادراک نہیں ہے۔

شاعری انعامِ الٰہی اور توفیق خداوندی کا دوسرا نام ہے۔توفیق خداوندی ہی کی بدولت شعراء ان عوامل وعواقب کا ادراک کر لیتے ہیں جو عام لوگوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ان کا کسی گھر، قبیلہ یا معاشرہ میں پیدا ہونا بھی محض اتفاق نہیں، عطیۂ غیبی ہے۔اس لئے اہل عرب صرف دو موقعوں پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ایک تو کسی کے گھر اولادِ نرینہ پیدا ہونے پر اور دوسرے کسی خاندان یا قبیلہ میں کسی شاعر کا ظہور ہونے پر۔

دنیا کی ہر مقتدر زبان میں ''شاعر'' کے ہم معنیٰ جو الفاظ ہیں ان سے عارف، حکیم، دانائے راز اور پیش بیں مراد ہے۔انگریزی لفظ POET بھی جس یونانی لفظ سے مشتق ہے اس کے معنی فاطر وصانع کے ہیں۔قدیم لاطینی زبان میں VATES ، نبی اور شاعر دونوں کے لئے استعمال

ہوا ہے۔

فارسی زبان کا مشہور قول کہ "شاعری پیغمبری کا جزو" ہے۔عوام وخواص سبھی کی زبان پر ہے۔غالب بھی جانتے تھے کہ وہ معمولی درجے کے شاعر نہیں ہیں اس لئے اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کا ہم پلہ نہ سمجھنے کے باوجود مدعی تھے کہ

پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

مگر عملاً انہوں نے اس انعام کی قدر نہیں کی جو مبداء فیاض نے انہیں صدیوں سے استعمال ہونے والے الفاظ کے نئے ابلاغی امکانات کو پالینے کی فکری بصیرت اور اس بصیرت کے اظہار کی فنی صلاحیت کی صورت میں عطا کیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو اگر یہ حق تھا کہ وہ کلام غالب کے فنی محاسن اور فکری بلندی کی بنیاد پر انہیں "ایک رب النوع" تسلیم کریں تو ان کے ۱۸۵۷ء کے بعد کے کلام کے معیار وتعداد کو دیکھ کر دوسروں کو بھی غالب کی شعر گوئی کی صلاحیت کے بڑی حد تک چھن جانے کو غضبِ الٰہی کہنے کا حق ہے جو "کفرانِ نعمت" کے سبب نازل ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے پر آشوب زمانہ پایا مگر یہ صحیح نہیں کہ تنہا آشوب زمانہ ہی نے ان سے ان کی خوشی، خوش طبعی اور خوش فکری چھین لی کیونکہ وہ آشوب ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی اپنی زندگی یا حال سے اوب چکے تھے۔انہیں کبھی اپنی اولاد کے نہ جینے کا غم کھائے جارہا تھا کبھی ذوق کے مرتبہ میں بڑھ جانے کا احساس۔کبھی بھائی کے دیوانہ ہوجانے کی خلش بے چین کئے رہتی تھی کبھی پنشن وخلعت کے چھن جانے کی کسک۔اس لئے ضاعت شعر سے متعلق ان کا یہ عذر تسلی بخش نہیں ہے کہ

"میں اموات میں ہوں، مردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔معشوق کس کو قرار دوں، جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟..........
.... ضاعت شعر، اعضاء و جوارح کا کام نہیں، دل چاہئے، دماغ چاہئے، ذوق چاہئے، امنگ چاہئے۔یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر میں ولولۂ شباب کہاں؟ رعایت فن، اس کے اسباب کہاں؟ انا للہ وانا الیہ راجعون[۱]

غالب کا کہا اگر صحیح ہوتا تو وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی شعر گوئی کی صلاحیت سے محروم

۱۔ بنام چودھری عبدالغفور سرور، اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۹ء

ہو گئے ہوتے کیونکہ اس وقت بھی وہ مایوسی کا شکار تھے اور تلخ و ترش لہجے میں اپنی ناقدری کے شکوے کرتے رہتے تھے حالانکہ ان کے عہد کے ایک سے ایک ارباب علم وفضیلت مثلاً مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا فضل حق خیرآبادی۔ سید احمد خاں، قابل قدر امراء ورؤسا مثلاً نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں، نواب الٰہی بخش خاں معروف، نواب علاء الدین احمد خاں علائی، استاذ شعراء مثلاً حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور اہم ارباب رشد و ہدایت مثلاً کالے میاں............... اور نہ جانے کتنے برگزیدہ لوگ ان کے قدردان اور معترف تھے۔ ان کا اردو دیوان بھی ان کی زندگی میں ۵ بار چھپ چکا تھا حالانکہ وہ اپنے اردو کلام کو فارسی کلام سے کمتر سمجھتے تھے۔

اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ غالب آشوب زمانہ کا شکار ہوئے تو بھی ان کی شعر گوئی پر زوال کا کوئی جواز نہیں ڈھونڈا جاسکتا کیونکہ تاریخ کے کسی دور میں ایسا نہیں ہوا کہ شہروں میں آگ لگی یا بستیوں پر قہر ٹوٹا تو تخلیق کاروں پر مردنی چھاگئی۔ بلکہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ سچے تخلیق کار صلیب کے سائے میں بھی معجزۂ فن کی نمود سے نسل انسانی کا سنگھار کرتے رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سیاسی انقلابات، روحانی انتشار اور اقتصادی کساد بازاری کے مختلف ادوار میں شعروادب کی تخلیق کے تمام سوتے کبھی کے خشک ہوگئے ہوتے۔

انسانی تاریخ کے ہر دور، کرۂ ارض کے ہر حصے اور نبی نوع انسان کے ہر طبقے میں قیامت خیز واقعات و حادثات کے ساتھ شعروادب کے ایک نئے اور پہلے سے زیادہ تابناک دور کا آغاز ہوا ہے۔ یورپ اس کی مثال ہے جو تاریکیوں میں ڈوب کر علم وادب کی روشنی سے سرفراز ہوا ہے۔ چین کی مثال تو ہمارے پڑوس کی ہے۔ یہ ملک جب اپنی بقاء کی جدوجہد میں ناقابل یقین سختیاں جھیل رہا تھا، اس وقت بھی اس کے فوجی دستے محاذ جنگ پر روانہ ہوتے تھے تو ان کے پیچھے پیچھے خچروں پر لدی ان کی کتابیں ہوتی تھیں اور لڑنے بھڑنے سے انہیں جیسے ہی فرصت ملتی تھی وہ کسی خندق یا غار میں لکھنا پڑھنا شروع کردیتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے غالب کے مقابلے، روس کے شاعروں اور دانشوروں کے لئے ۱۹۱۷ء کا انقلاب زیادہ صبر آزما رہا ہے۔ ولادیمیر مایاکوفسکی Vladimir Mayakovsky (۱۸۹۳-۱۹۳۷)، بورس پاسترناک Boris Pasternak (۱۸۹۰-۱۹۶۰) اور بورس یسے نن Boris Yessenin (۱۸۹۵-۱۹۲۵) جس قسم کے حالات سے دوچار ہوئے ان کی تفصیل سے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

مایا کوفسکی اور یسے نن خودکشی پر مجبور ہوئے مگر انہوں نے اپنے ضمیر پر پہرے داری قبول کی نہ اس کی آواز کے فنکارانہ اظہار پر حرف آنے دیا۔ اسی طرح پاسترناک جبر وقہر کے سائے میں اپنی ضمیر کی لو سے دیار شعر وادب میں اجالے بکھیرتا رہا مگر غالب انگریزوں کی جھوٹی مدح یا وقت سے پہلے مرنے کی تمنا کرتے رہے حالانکہ وہ مایا کوفسکی، یسے نن اور پاسترناک پر ٹوٹنے والے قہر یا انہیں پیش آنے والے حالات وواقعات سے بھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی شعر گوئی پر زوال کو "کفران نعمت" کے عوض نازل ہونے والے عتاب کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے؟

☆☆☆

۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے خطوط

تاریخی ترتیب سے

اگر کسی تحریر کو بیک وقت شوخی وافسردگی کا کرشماتی نمونہ بننے کا اعزاز حاصل ہے تو وہ غالب کے خطوط کی نثر ہے۔ مراسلے کو مکالمے میں تبدیل کرنے کے علاوہ روزمرہ کے لفظوں اور برجستہ و بے ساختہ جملوں میں اپنی بات کہہ جانے کا غالب کا اسلوب تکلف وتصنع سے پاک نہایت فطری اور پر اثر اسلوب ہے۔

اسلوب اور ادبی لسانی حیثیت کے علاوہ یہ خطوط اس لئے بھی اہم ہیں کہ ان میں غالب کی مکمل شخصیت موجود ہے اور انہیں خطوط کی روشنی میں غالب کے احوال کے ساتھ ان کے عہد کے حالات وواقعات سے متعلق ان کا اندازفکر بھی سامنے آتا ہے۔

ان خطوط کے غالب اپنے آدمی ہونے پر شرمندہ نہیں بلکہ اتنے بے باک ہیں کہ چند اہم واقعات کے علاوہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور زندگی کی ادنیٰ ترین حقیقتوں کو بھی بے جھجک تسلیم کرلیتے ہیں۔ ان کے خطوط میں، عہد اور معاشرہ کی تصویروں کے ساتھ زندگی جینے کی شدید خواہش، آرزو اور شکستِ آرزو کے ناتمام سلسلے اور کسی سے کسی طرح کچھ بھی پالینے کی تمنا بہت شدید ہے۔

یہ خطوط محض کاغذ قلم، کاتب ومکتوب الیہ، حرف مدعا اور احوال دگر نہیں ہیں بلکہ ان میں زندگی کی ہماہمی کے ساتھ مرگ آسا سناٹے میں مرنے کے اندیشے اور جینے کے حوصلے ہیں۔ کبھی لڑتے جھگڑتے، گالم گلوج کرتے اور کبھی ہنستے بولتے، خبرگیری کرتے گوشت پوست کے انسان ہیں۔ ان میں پابند وآزاد آدمیوں کی مختلف کیفیتوں اور حالتوں کی پردہ داری اور تصویرکشی ہے یعنی ان خطوط میں غالب کی زندگی، انسانی زندگی کی جملہ کثافتوں اور لطافتوں کا مجموعہ بن کر سامنے آئی ہے۔

احساس جتنا زیادہ ہو، احساس نارسائی کا زخم اتنا ہی گہرا ہوتا ہے، اس لئے حواس کی بیداری اور لہو کی گردش سے آواز وحرف کو نئے جہان معنیٰ سے آشنا کرنے، دشت امکاں کو ایک نقش پا سے زیادہ نہ سمجھنے اور تمنا کے دوسرے قدم کے لئے جہان تازہ کی ضرورت کا احساس دلانے والے غالب، احساس نارسائی کے دیئے ہوئے زخموں سے کچھ زیادہ ہی پریشان رہے ہیں۔ انہیں کبھی بچوں کے نہ جینے، ذوق کے ان سے رتبہ میں بڑھ جانے اور خاطرخواہ شہرت ومنصب نہ ملنے کا غم ستاتا رہا ہے اور کبھی دلی کے اجڑنے، احباب کے بچھڑنے اور خلعت وپنشن سے محروم ہوجانے یا خلعت وپنشن میں

اضافہ نہ ہونے کا رنج۔

بکھرے خطوط کو یکجا کر کے شائع کرنے کا خیال سب سے پہلے منشی ہرگوپال تفتہ اور منشی شیونرائن آرام کو آیا تھا لیکن غالب نے انتہائی عزیز رکھنے کے باوجود ان دونوں کی ایسی حوصلہ شکنی کی تھی کہ انہوں نے خطوط غالب کی ترتیب و اشاعت کا خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا تھا۔ بعد میں چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں نے ان خطوط کو بغیر اجازت شائع کرنے کا ارادہ کیا جو غالب نے سرور کو لکھے تھے۔ اس مجموعہ کا نام "مہر غالب" رکھا گیا تھا اور اس میں سرور کا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی شامل تھا لیکن ممتاز علی خاں کے دل میں یہ خیال آنے پر کہ اس میں دوسروں کے نام لکھے ہوئے غالب کے خطوط بھی شامل کر لئے جائیں، اس کی اشاعت ملتوی ہو گئی تھی۔

۱۸۶۶ء میں غالباً انگریزوں کو اردو پڑھانے کی غرض سے غالب نے اپنی نظم و نثر کا انتخاب شائع کیا تو اس میں دیگر تحریروں کے ساتھ میر مہدی مجروح کے نام اپنے ۲ خطوط بھی شامل کئے اسی طرح غلام غوث خاں بے خبر نے جب خطوط غالب کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کیا تو غالب نے نہ صرف اس کی اشاعت کی اجازت دی بلکہ انہیں اپنے کئی خطوط کی نقلیں بھی فراہم کیں۔

منشی ہرگوپال تفتہ غالب کے معتمد، مزاج شناس اور عزیز شاگرد تھے۔ اسی طرح منشی شیو نرائن آرام، غالب سے قلبی تعلق رکھنے کے علاوہ مطبع 'مفید خلائق' آگرہ کے مالک و مہتمم تھے اور انہیں دونوں شاگردوں نے 'دستنبو' کی اشاعت کو ممکن بنایا تھا حالانکہ غالب کے اشاعتی کام کو دیکھنے والوں میں ان کے علاوہ مرزا حاتم علی مہر، منشی نبی بخش حقیر اور ان کے بیٹے منشی عبداللطیف بھی شامل تھے۔ اس لئے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ غالب نے ان دونوں سعادتمندوں کی درخواست کو ٹھکرا کر [۱] اپنے خطوط کا مجموعہ شائع کرنے کی اجازت غلام غوث خاں بے خبر کو ہی کیوں دی تھی؟

جہاں تک تفتہ اور آرام کو خطوط غالب کے مجموعے کی اشاعت کی اجات نہ دینے کا سوال ہے، غالب نے خود ہی اس کا جواب دیا ہے:

> "اردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی تشہیر میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضروری ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے" [۲]

۱۔ غالب بنام منشی ہرگوپال تفتہ ۲۰ رنومبر ۱۸۵۸ء

۲۔ غالب بنام منشی شیونرائن آرام ۱۸ رنومبر ۱۸۵۸ء

اب رہا یہ سوال کہ اگر غالب واقعی اپنے اردو خطوط کو ناقابل اشاعت سمجھتے تھے تو انہوں نے غلام غوث خاں بے خبر کو ان کا مجموعہ شائع کرنے کی اجازت کیوں دی؟ اس سلسلہ میں قرین قیاس یہ ہے کہ جب تفتہ اور آرام نے اردو خطوط شائع کرنے کی اجازت مانگی تھی، اس وقت غالب واقعی اپنے اردو خطوط یا کم از کم ان خطوط کو جو تفتہ اور آرام شائع کرنا چاہتے تھے ناقابل اشاعت سمجھتے رہے ہوں لیکن بعد میں انہیں اپنے خطوط کی ادبی لسانی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہو اور انہوں نے رائے بدل دی ہو۔

تفتہ اور آرام کو اپنے اردو خطوط کے مجموعہ کی اشاعت سے رد کنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب کئی برس تک اپنی کسی بھی تحریر کو منظر عام پر لانے سے ڈرتے تھے، مبادا وہ تحریر کسی انگریز حاکم یا مخبر کے ہاتھ لگے اور ان کے لئے پریشانیاں کھڑی ہوں۔ اسی لئے نواب یوسف علی خاں اور دوسرے مکتوب الیہم کے نام انہوں نے اپنے بہت سے خطوط خود ہی ضائع کر دیئے تھے یا مکتوب الیہم کو انہیں ضائع کر دینے کی تاکید کی تھی۔

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ غلام غوث خاں بے خبر کو خطوط کا مجموعہ شائع کرنے کی اجازت دینے اور خود ہی کئی خطوط کی نقلیں فراہم کرنے کے باوجود وہ اس مجموعے کیلئے دیباچہ لکھنے سے نہ صرف مسلسل گریز کر رہے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ یہ مجموعہ نہ شائع ہو:

> ''اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لاوے تو جرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعہ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے تو اس مجموعے کا چھپ جانا، بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا، بالضم چاہتا ہوں۔
>
> سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:
>
> رسم ست کہ مالکان تحریر   آزاد کنند بندۂ پیر
>
> آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں، پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟''[1]

بے خبر نے ۶۱ء میں خطوط جمع کرنے کا کام شروع کیا تھا لیکن جب ۱۸۶۵ء تک ان کی اشاعت نہ ہو سکی اور غالب، دیباچہ لکھنے سے گریز کرنے کے باوجود مجموعہ کی اشاعت پر اصرار کرتے رہے۔[2] تو انہوں نے اپنے جمع کئے ہوئے تمام خطوط منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیئے

۱۔ غالب بنام غلام غوث خاں بے خبر ۱۸۶۲ء

۲۔ غالب بنام غلام غوث خاں بے خبر ۱۸۶۳ء، ۷ر مارچ ۱۸۶۴ء

منشی ممتاز علی خاں نے ''مہر غالب'' (جس کی اشاعت معرض التوا میں تھی) اور بے خبر کے بھیجے ہوئے مجموعہ خطوط کو یکجا کر کے ۲۷/اکتوبر ۱۸۶۸ء کو ''عود ہندی'' کے نام سے شائع کیا۔ اس مجموعہ میں سرورؔ اور منشی ممتاز علی خاں دونوں کے لکھے دیباچے شامل ہیں۔

''اردوئے معلٰے'' (پہلا حصہ) ۶مارچ ۱۸۶۹ء یعنی غالب کے انتقال کے ۱۹ دن بعد شائع ہوئی۔ اس کا دیباچہ میر مہدی مجروح نے اور خاتمہ قربان علی بیگ سالکؔ نے لکھا ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف غالب کی نگرانی میں شائع ہوا ہے بلکہ اس میں ان کی یہ تحریر بھی ہے کہ ''میں نے از راہ فرط محبت اپنا حق تالیف نورچشم اقبال نشاں حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے۔''

''اردوئے معلٰی'' اور ''عود ہندی'' کے اب تک کئی ایڈیشن اور ری پرنٹ شائع ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک نثر غالب کے پرستاروں کے ذوق کی سیری نہیں ہوئی ہے لہٰذا ان کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہنا یقینی ہے۔

'عود ہندی' اور 'اردوئے معلٰی' کے علاوہ خطوط غالب کے کئی اور مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں جن میں مرزا محمد عسکری کے 'ادبی خطوط'، مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے ''مکاتیب غالب'' مولوی مہیش پرساد کے ''خطوط غالب'' اور ''خطوط غالب'' کا وہ اڈیشن جس پر مالک رام نے نظر ثانی کی ہے، آفاق حسین آفاق کے ''نادرات غالب'' مولانا غلام رسول مہر کے ''خطوط غالب'' اور ڈاکٹر خلیق انجم کے ''غالب کے خطوط'' (۵ جلدوں میں) بہت اہم ہیں۔

کاظم علی خاں کی تحقیق کے مطابق غالب کے مکتوب الیہم کی تعداد ۹۰ اور آج تک کے دستیاب کل خطوط کی تعداد ۸۷۱ ہے لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کے مجموعہ میں مکتوب الیہم کی تعداد ۹۲ اور کل خطوط کی تعداد ۸۹۴ ہے۔[1]

سب سے پہلے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ''مکاتیب غالب'' کو تاریخی ترتیب سے جمع کیا تھا۔ بعد میں مولوی مہیش پرشاد، آفاق حسین آفاق اور مولانا غلام رسول مہرؔ نے بھی تاریخی ترتیب کا لحاظ کرتے ہوئے غالب کے خطوط مرتب کیے اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا عرشی اور مولوی مہیش پرساد نے بڑے اہم تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں اور ان دونوں کے تحقیقی کارناموں کو کئی اعتبار سے اولیت حاصل ہے لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اب تک کے غالب کے تمام دستیاب خطوط تاریخی ترتیب سے جمع کر دیے ہیں بلکہ ان کی تاریخ متعین کرنے، متن کی تدوین جدید کرنے، خطوط کے مالۂ وماعلیہ کے بارے میں تفصیلی حواشی قلمبند کرنے اور آج تک کے تمام

۱- غالب کے خطوط، ڈاکٹر خلیق انجم، جلد ۵ نئی دہلی ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۵

اڈیشنوں کے حسن وقبح کو بیان کرنے میں انتھک محنت کی ہے۔ان کی ترتیب دی ہوئی غالب کے خطوط کی پانچوں جلدیں غالب کے دوسرے تمام مجموعہ ہائے خطوط وانتخابات سے بے نیاز کردیتی ہیں۔ پانچویں جلد میں غالب کے خطوط کی تاریخی فہرست دی ہے یعنی انہوں نے کس تاریخ میں کس شخصیت کو خط لکھا تھا اور اس طرح یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ایک تاریخ میں غالب نے کل کتنے خط لکھے۔

اردو خطوط کی طرح غالب کے فارسی خطوط بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔''پنج آہنگ'' کے بیشتر خطوط کا ترجمہ مکمل کرلیا تھا اور اس کے بعد ''نامہ ہائے فارسی''،''مجموعہ ڈھاکہ'' اور متفرق خطوط کی باری تھی جو بہت بڑی تعداد میں بکھرے ہوئے ہیں مگر اسی دوران ان پر منکشف ہوا کہ غالب کے جو فارسی خطوط ایک سے زائد مجموعہ میں شامل ہیں، ان کے متون میں بڑا فرق ہے۔

ترجمہ، ترتیب وتدوین اور متنی تنقید ان کا اصل میدان ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ متن کی تصحیح کے بغیر ترجمہ کی صحت ممکن نہیں ہے۔اس لئے انہوں نے ترجمے کا کام مؤخر کرکے ساری توجہ بکھرے ہوئے فارسی خطوط کے متون کی تصحیح پر مرکوز کردی ہے۔ متن کی تصحیح کے بعد ترجمہ وترتیب کی باری ہے۔ اردو دنیا اب بجاطور پر یہ امید کرسکتی ہے کہ غالب کے اردو خطوط کی طرح غالب کے فارسی خطوط کی جمع وترتیب اور تصحیح وترجمہ کی صورت میں ڈاکٹر خلیق انجم کا جو تحقیقی کارنامہ منظر عام پر آئے گا وہ ان کے متوازن تنقیدی مزاج، تخلیقی دیدہ وری اور صالح ذوق جستجو کا آئینہ ہوگا۔

قاضی عبدالودود کی 'مآثر غالب' غالب کے ۳۲ غیر مطبوعہ فارسی خطوط اور دوسری کم یاب اردو اور فارسی تحریروں پر مشتمل ہے جو پہلے علی گڈھ میگزین کے غالب نمبر ۹-۱۹۴۸ میں اور پھر انجمن ترقی اردو، بہار کے زیر اہتمام ستمبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ نے اس کتاب کو ڈاکٹر حنیف احمد نقوی کی فاضلانہ ترتیب وتصحیح کے ساتھ ۱۹۹۵ء میں دوبارہ شائع کیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ دوسرے حصہ میں ۳۲ فارسی خطوط ہیں جن میں سے ۲۷ پہلی مرتبہ شائع ہوئے ہیں۔ ۴ پروفیسر مسعود حسین رضوی کی مرتبہ ''متفرقات غالب'' میں شامل تھے۔

غالب کی نظم ونثر کے ہر حصہ کے متعلق قاضی عبدالودود کے عالمانہ حواشی میں فراہم کی گئی معلومات نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی اپنے آپ میں مکمل ہیں لیکن ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے ان میں اضافہ اور تصحیحات کے ساتھ جو دوسرے مفصل اور دقیق حواشی لکھے ہیں وہ بذات

خود ایک عظیم علمی تحقیقی کارنامہ ہے۔ مجموعے کے مشمولات بیان کرنے کے علاوہ انہوں نے خطوط کے مطالب کی اہمیت پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور تدوین کی جزئیات بیان کی ہیں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے مجموعہ کے شانِ نزول کے ساتھ کچھ مشاہدات بیان کیے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

کالی داس گپتا رضاؔ کئی سال سے غالب کے فارسی خطوط کے اردو تراجم کے ساتھ تمام اردو خطوط کو تاریخی ترتیب سے جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے اور ۱۸۲۵ء سے ۱۸۶۷ء تک کے خطوط ترتیب دے چکے تھے! کہ اچانک انتقال کر گئے۔ لیکن ''پنج آہنگ'' کی ترتیب نو کی صورت میں ان کا ایک اہم تحقیقی کام پہلے ہی منظر عام پر آ چکا ہے۔

''پنج آہنگ'' کے دو اڈیشن غالب کی زندگی ہی میں شائع ہوئے تھے، بعد میں غالب نے ان کو 'کلیات نثر غالب' میں شامل کر لیا جس میں دونوں مجموعوں کے مقابلے زیادہ خطوط ہیں۔

گپتا رضاؔ کے ترتیب دیئے ہوئے ''پنج آہنگ'' میں مکتوب الیہم کے نام کے ساتھ ۱۶۹ خطوط کے متن شامل ہیں یعنی اب ایک ''مستند پنج آہنگ'' ہمارے سامنے ہے البتہ اس کے ترجمے کی ضرورت اب بھی باقی ہے کیونکہ تنویر احمد علوی کا ترجمہ منظر عام پر آنے کے بعد کئی نئے خطوط کی نشاندہی ہوئی ہے۔

غالب کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان پر تاریخ لکھنے کے پابند تھے اور کبھی عیسوی تاریخ لکھتے تھے، کبھی ہجری اور کبھی دونوں۔ ایسے خطوط بھی کافی تعداد میں موجود ہیں جن کے آخر میں انہوں نے تاریخ کے ساتھ دن بھی لکھے ہیں۔ کہیں دنوں کے فارسی نام یعنی شنبہ، یکشنبہ لکھے ہوئے ملتے ہیں، کہیں ہندوستانی نام جیسے اتوار، سوموار اور کہیں یوم الخمیس، آدینہ وغیرہ... کہیں کہیں انہوں نے وقت بھی درج کر دیا ہے جیسے صبح چاشتگاہ، نیم روز، وقت نماز ظہر... وغیرہ

بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ایسے خطوط کے متن کو پڑھ کر واقعات کے ذریعہ تاریخ کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تاریخ کا تعین نہیں ہوسکا ہے لیکن سنہ کا اندازہ ہو گیا ہے، اس خط کو اس سنہ کے دیگر خطوط کے ساتھ آخر میں شامل کر لیا ہے۔ زیر نظر انتخاب چونکہ غالب کے جملہ خطوط کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ۱۸۵۷ء سے متعلق خطوط یا خطوط کے بعض حصوں کا انتخاب ہے۔ اس لئے ان پر شروع ہی میں تاریخ دے دی گئی ہے تاکہ پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جائے کہ متعلقہ واقعہ یا حال کس تاریخ کا ہے؟

۱۸۵۷ء ہماری قومی تاریخ کا وہ اہم سال ہے جس سے ہندوستان کی سیاسی سماجی اور معاشی

ا۔ مجھے یہ مجموعہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ لیکن انہوں نے ٹیلیفون پر گفتگو کے دوران بارہا اس کا ذکر کیا تھا۔

تباہی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کی نفسیات میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ ہندوستانیوں کے ایک طبقہ نے انگریزوں کے اقتدار کا پایہ بننا منظور کیا اور دوسرے نے خون کی دھار سے انگریزوں کے تیغ و خنجر کی دھار کو کند کر دینے کی قسم کھائی۔

غالب ان لوگوں میں تھے جنہیں ہندوستان کے تباہ ہونے یا غلام ہونے کا نہیں بلکہ اپنی پنشن وخلعت سے محروم ہونے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ پوری طرح انگریزوں کے طرفدار تھے مگر یہ بھی جانتے تھے کہ انگریزوں کی طرفداری کے شبہ میں عوام نے حکیم احسن اللہ خاں ایسوں کا کیا حشر کیا ہے؟ اس لئے انہوں نے اپنے خطوط خصوصاً نواب یوسف علی خاں ناظم کو لکھے ہوئے خطوط کو ضائع کرنے کی تاکید اور اپنے خطوط میں حد درجہ احتیاط کا اہتمام کر کے اپنی انگریز نوازی کو شعوری طور پر چھپانے کی کوشش کی ہے لیکن انگریزوں کے استقبال اور اپنے ساتھ پوری قوم کے مستقبل کو انگریزوں سے وابستہ کر دینے کی شدید خواہش کے سبب وہ لاشعوری طور پر اپنے خطوط میں ایسی بہت سی باتیں لکھ گئے ہیں جو وہ شعوری طور پر چھپانا چاہتے تھے۔ شعور ولاشعور کی اس کشمکش سے ایک نئے اسلوب کی بنیاد پڑی ہے اور ان خطوط کی ادبی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن ان کی صداقت واقعیت مشتبہ ہو گئی ہے۔

غالب کے بیانات، دلی کی بربادی سے ہونے والے ذاتی نقصانات، ملازمان قلعہ پر شدت کی خبر، عزت و روٹی لٹنے کے غم، نواب یوسف علی خاں ناظم اور منشی ہرگوپال تفتہ وغیرہ سے ملنے والی رقوم پر خوشی، بے گناہی پر اصرار، سکہ کے الزام سے برأت، تنخواہ، پنشن اور قرض کی روداد، انگریزوں کے احکام واقدام میں دلچسپی، موت، گرانی اور بدامنی سے پریشانی یعنی ہجوم غم اور غم مرگ کے ذکر سے عبارت ہیں۔ بیچ بیچ میں وہ چھوٹے چھوٹے ایسے بلیغ جملے بھی لکھتے گئے ہیں جو زخموں کے لئے مرہم کا کام کرتے ہیں مثلاً ''بزرگوں کا مرنا ہی بنی آدم کی میراث ہے'' لیکن ان بیانات کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ان میں انگریزوں کی بے پناہ خوشامد، ان کی عنایتوں کے شکریہ میں غلو، ان کی فتوحات پر خوشی اور ان کے قتل کئے جانے پر شدید غم وغصہ کا اظہار کیا گیا ہے لیکن انگریزوں کے ہاتھوں ہزاروں بے گناہ ہندوستانیوں اور حریت پسندوں کے بہیمانہ قتل کو یہ کہہ کر جائز ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فاتح ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ غالب نے اس احساس وادراک کو بھی پاس پھٹکنے نہیں دیا ہے کہ آزادی، ہر شخص، ہر قوم، ہر ملک کا پیدائشی اور فطری حق ہے۔ اس حق کو سلب کرنے والوں کے خلاف نہ لڑنے والے نہ صرف بزدل بلکہ فطرت انسانی کے بھی دشمن ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ غالب جیسے عظیم شاعر کو، یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ 'انقلاب ستاون' کی ناکامی

ہی سے ایک ایسا انقلاب پیدا ہوگا جو سمندر پار سے آئے لٹیروں اور حملہ آوروں کو واپس بھاگنے پر مجبور کردے گا کیونکہ ۱۸۵۷ء ہی میں عام ہندوستانیوں کو احساس ہوگیا تھا کہ 'ہم غلام ہیں' اور حقیقت یہ ہے کہ آزادی اسی احساسِ غلامی کا دوسرا نام ہے۔

۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے نقطہ نظر کو اس صورت میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے جب ان کے وہ تمام خطوط ہمارے سامنے ہوں جن میں کسی بھی صورت میں ۱۸۵۷ء کے واقعات و حالات کا تذکرہ ہے یا غالب نے ان پر رائے زنی کی ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اپنی کتاب ''غالب اور انقلاب ستاون'' میں غالب کے خطوط کے وہ حصے جمع کردیئے ہیں جو براہ راست یا بالراست ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب سے متعلق ہیں مگر چونکہ اس کتاب میں خطوط تاریخی ترتیب سے نہیں جمع کئے گئے ہیں بلکہ ایک ہی خط کے حصے بخرے کر کے کئی جگہ شائع کیے گئے ہیں، اس لئے ان سے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔

یہاں ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے تمام خطوط کے متعلقہ حصے تاریخی ترتیب سے جمع کردیئے گئے ہیں۔ انہیں تسلسل سے پڑھنے اور ان میں بیان کئے ہوئے واقعات و حالات کا ہم عصر روزناچوں، تذکروں، حکام کی خفیہ اور انتظامی رپورٹوں اور مورخین کی بیان کی ہوئی شہادتوں سے موازنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ غالب سے کہاں سہو ہوا ہے، کہاں انہوں نے قصداً جھوٹ کا سہارا لیا ہے؟ اور کہاں انہوں نے انگریزوں کے بے پناہ مظالم کے حوالے مصلحتاً حذف کردیے ہیں؟

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد غالب کا جو پہلا خط دستیاب ہے وہ ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء کا ہے اس خط کو مکمل نقل کیا جارہا ہے اور باقی خطوط کے متعلقہ حصوں کو تاریخی ترتیب سے۔ اس سلسلے کا آخری خط جس کی عبارت ہم نے آخر میں درج کی ہے، ۱۵ر فروری ۱۸۶۷ء کا ہے۔ ۹ رسال چند ماہ کے درمیان میں لکھے جانے والے ان خطوط کے مطالعے سے گذشتہ سطور میں پیش کردہ ہمارے مباحث و نتائج کی توثیق ہوجائے گی۔

☆☆☆

۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء

"صاحب !

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت درپیش آئے، شعر کہے، دیوان جمع کیے، اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا، ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا، اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہر گوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں، اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلّی ماروں کا محلّہ ہے؛ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان، اس شہر میں نہیں ملتا: کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکمیوں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبانِ عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقتِ غارتِ دہلی، یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح، راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنسن دار، دولت مند، اہل حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں، خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے؛ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں،

دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے؛ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔[1] جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک، یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بہ دستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہئے، مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہ ہر حال، منشی صاحب کو میرا اسلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا، اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔"

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۲۱ر دسمبر ۱۸۵۷ء

"حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں۔ کسی محکمہ میں ابھی تک بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟"

(بنام حکیم غلام نجف خاں)

۲۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء

"انصاف کرو، (خط) لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟... بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔"

(بنام حکیم غلام نجف خاں)

۱۹ر جنوری ۱۸۵۸ء

"جو دم ہے، غنیمت ہے۔ اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں، قلم ہاتھ میں لئے پر، جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون"

(بنام حکیم غلام نجف خاں)

۳۱ر جنوری ۱۸۵۸ء

میں تم کو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گے؟....

۱۔ سیاست ملک کے انتظام اور سزا دونوں ہی کو کہتے ہیں۔ اس سے غالب کی مراد یہ ہے کہ مجرموں کو سزا ملتی جاتی ہے۔

بھائی! میرا حال یہ ہے کہ دفترِ شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، دارو گیر سے محفوظ ہوں، کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں مگر ہاں، جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں آیا، کسی حاکم کو نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا، کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی (۱۸۵۷ء) سے پنسن نہیں پایا۔ کہو، یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے؟ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔"

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۳؍فروری ۱۸۵۸ء

"بھائی بری آ بنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔"

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۷؍فروری ۱۸۵۸ء

"کیا پنسن اور کہاں اس کا ملنا! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں:

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو! آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے؟

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔" تم کہتے ہو کہ آیا چاہتا ہوں" اگر آؤ تو بے ٹکٹ کے نہ آنا.......

میں مخفی نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں۔ حکام جانتے ہیں کہ یہ یہاں ہے مگر نہ باز پرس و گیر و دار میں آیا ہوں، نہ خود اپنی طرف سے قصد ملاقات کا کیا ہے۔ بہ ایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہے؟"

(بنام میر مهدی مجروح)

۵؍مارچ ۱۸۵۸ء

"مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا.........

میرا حال بہ دستور ہے۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے؟ حاکمِ اکبرآباد نے آکر کوئی نیا بندوست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب، میرے آشنائے قدیم ہیں مگر میں مل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے، ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔"

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۱۲/ مارچ ۱۸۵۸ء

''یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو (۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے) لگاؤ نہ تھا۔......

وہ عزت اور وہ ربط ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔''

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

یکم اپریل ۱۸۵۸ء

''تم کو مبارک ہو کہ حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) پر سے وہ سپاہی، جو ان کے اوپر متعین تھا، اٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو، مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو... صفدر میرے پاس آیا تھا، یہ اس کی زبانی ہے۔ جی ان کو دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از راہ احتیاط جا نہیں سکتا۔''

(بنام حکیم غلام نجف خاں)

اپریل ۱۸۵۸ء

''جناب حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) ایک روز از راہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ ان کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ میاں، میں کثیر الاحباب شخص ہوں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو، جو دوست اب باقی ہیں، بہت عزیز ہیں۔ واللہ! دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔

مصطفیٰ خاں (شیفتہ: جنہیں ۱۸۵۸ء کے ہنگامے میں شرکت کے بے بنیاد الزام پر سات سال قید کی سزا دی گئی) کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعے میں چھوٹ جائے۔ ورنہ حبسِ ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں؟

احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں؟ مخنوق ہوا (پھانسی پائی) گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔

پنسن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بہ شرطِ اجرا بھی میرا کیا گزارا ہوگا؟ ہاں، دو باتیں ہیں:

ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام: ''چو لھے دلتہ رنہ ہوگا۔''

(بنام حکیم غلام نجف خاں)

جون یا جولائی ۱۸۵۸ء

''انگریز کی قوم میں سے، جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے!.... ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا، تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔''

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

اوائل جولائی ۱۸۵۸ء

''ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟''

(بنام حاتم علی مہرؔ)

اوائل جولائی ۱۸۵۸ء

''ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ بندہ نواز! یہ بھی انہیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔''

(مرزا حاتم علی بنام مہرؔ)

۱۸/ جولائی ۱۸۵۸ء

''بھائی صاحب کا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور وہ میرے خط کے جواب میں ہے.... جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور اک شامی رومال ڈھائی گزا (پیسوں کی ضرورت سے فروخت کے لئے) دلال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔''

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۱۸؍جولائی ۱۸۵۸ء

''پنسن اگرچہ ملے گا، لیکن دیکھئے کب ملے گا؟ اسکے ملنے تک کیا ہوگا اوراس کے ملنے سے میرا کیا کام نکلے گا؟ قطع نظران امور سے، اس وجہِ قلیل کو کس بستی میں بیٹھ کر کھاؤں گا؟ یہ شہر، اب شہر نہیں، قہر ہے''

(بنام حکیم غلام نجف خاں)

اگست ۱۸۵۸ء

'' ہاں، غلام فخر الدین خاں کی رہائی، زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک کرے۔ سنا ہے لوہارو بھی ان دونوں صاحبوں (امین الدین احمد خاں، اور ضیاء الدین احمد خاں) کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے۔ خدا سب کا بھلا کرے۔ مجھ کو صاحب ڈپٹی کمشنر نے بلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ ''غدر'' میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدۂ ولایت میں نے پڑھائے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز و ادا سے پنسن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔

(بنام حکیم غلام نجف خاں)

۳؍ستمبر ۱۸۵۸ء

'' مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو، دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں؟۔''

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۷؍ستمبر ۱۸۵۸ء

'' درخت جگہ سے اکھڑ کر بہ دشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے؟ سنی الگ، شیعہ الگ، نیک جدا، بد جدا۔''

(بنام میر مہدی مجروح)

۲۱؍ستمبر ۱۸۵۸ء

'' حضرت یہاں دو خبریں مشہور ہیں۔ ان کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں... لوگ کہتے ہیں، آگرہ میں اشتہار جاری ہوگیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہوگیا۔.................. سچ ہونا (اس کا) آپ کے خط لکھنے پر

منحصر ہے۔''

(بنام حاتم علی مہرؔ)

۲۳/اکتوبر ۱۸۵۸ء

''بادشاہ (ظفر) کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اجڑا ہوا شہر، نہ آدمی، نہ آدم زاد، مگر ہاں دو ایک مصوروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے، وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔ تصویریں بھی ان کے گھروں سے لٹ گئیں۔ جو کچھ رہیں، وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید لیں۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے، وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں۔ تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے، اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے..... میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے۔ اگر کہیں سے ہاتھ آ جائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مصوروں سے خرید کرنے کا نہ خود مجھ میں مقدور، نہ تمہارا نقصان منظور۔''

(بنام شیونرائن آرامؔ)

اکتوبر ۱۸۵۸ء

''.....روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں، جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے.... بھائی! میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خان کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا۔ ان کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا.....؟''

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء

''حکم ہوا ہے کہ دوشنبے کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہانِ انگریز اپنے اپنے گھروں میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پایا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور ایک قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔''

(بنام شیونرائن آرامؔ)

اگست تا نومبر ۱۸۵۸ء

''منہ پیٹتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا ہوں، الٰہی حیاتِ جاودانی نہیں مانگتا، پہلے انوار الدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں، پھر اس کے بعد مروں۔

روپے کا نقصان اگرچہ جانکاہ اور جاں گزا ہے، پر بہ موجب ''تلف المال خلف العمر'' عمر فزا ہے۔ جو روپیہ ہاتھ سے گیا ہے۔ اس کو عمر کی قیمت جانیئے اور اثباتِ ذات اور بقائے عرض و ناموس کو غنیمت جانیئے۔''

(بنام نواب انورالدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق)

۵ر نومبر ۱۸۵۸ء

''یہاں پہلی نومبر کو دوشنبے کے دن حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزندِ ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں:.........

نونہال دوستی کے بردہد حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

اللہ اللہ اللہ

(بنام نواب انورالدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق)

۷ر نومبر ۱۸۵۸ء

''خدا کا شکر ہے کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ، کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔''

(بنام نواب یوسف علی خاں ناظم)

۲۰ر نومبر ۱۸۵۸ء

''حکمِ عفوِ تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب و پیکار دے کر توقیعِ آزادی پاتے ہیں۔''

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۲۲ر دسمبر ۱۸۵۸ء

''چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا گیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام، کچھ نہیں۔ پنسن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ سے جے پوری کی زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھئے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے

از روئے قیاس، جیسا کہ دلی کے خبرتراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑادی ہے، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری، شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنسن داروں کو جھولیاں بھربھر روپے دیے جائیں گے۔ خیر، آج بدھ کا دن، (تاریخ) ۲۲ دسمبر کی ہے۔ اب شنبے کو بڑا دن اور اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دن ہے۔ اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا۔ تم اس خط کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔''

(بنام میر مہدی مجروح)

۱۸۵۸ء

مرزا نسیمی کو دعا پہنچے۔ آنکھ کی گہاجنی جب خود پک کر پھوٹ گئی تھی اور پیپ نکل گئی تھی تو نشتر کیوں کھایا؟ مگر یہ کہ بہ طریقِ خوشامد طبیب سے رجوع کی۔ جب اُس نے نشتر تجویز کیا تو خواہی نہ خواہی امتثال اِمر کرنا پڑا اور شاید یوں نہ ہو، کچھ مادہ باقی ہو، بہ ہر حال حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شفا بخشے۔:

قطعہ

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج	ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے	گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک	تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک	آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا	وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ	سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم	ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے، یارب	کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

(بنام نواب علاء الدین احمد خاں علائی)

۱۸۵۸ء

''وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ، اللہ، اللہ! ہزاروں کا میں ماتم دار ہوا، میں مروں

گا تو مجھ کو کون روئے گا؟..... کیا مجمع برہم ہوا ہے! مجھ کو کیسا غم ہوا ہے۔"

(بنام میر سرفراز حسین)

۱۸۵۸ء

"کیسی صاحب زادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو، جیسی آگے تھی؟ قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں، اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں، اور انکے بھائی مع قبائل وعشائر لوہارو ہیں۔ لال کنویں کے محلے میں خاک اڑتی ہے.... لکھمی کی دکان پر کتے لوٹتے ہیں۔"

(بنام مولوی عزیز الدین)

۱۸۵۸ء

"یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو؟ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں، بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ (بطورِ اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے۔"

(بنام شیونرائن آرام)

۳۰ر جنوری ۱۸۵۹ء

"گنہ گار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔"

(بنام خواجہ غلام غوث خاں بے خبر)

۲ر فروری ۱۸۵۹ء

"نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہاں گیر آباد کی زمین داری اور دلی کی املاک اور پنسن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ دن و تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتے کو گیا منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا

جائے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا، دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ "اسد اللہ خاں پنسن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ ابتک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکمِ وقت کو اختیار ہے۔" پرسوں یہ عبارت جماعہ دار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں، جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بہ قدرِ مقدور نذرانہ دے۔ اسکا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ و الحکم للہ

(بنام میر مہدی مجروح)

فروری ۱۸۵۹ء

بھائی! لکھنؤ میں وہ امن وامان ہے کہ نہ ہندوستانی عمل داری میں ایسا امن وامان ہوگا نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہوگا۔ امرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں، بہ قدرِ رتبہ تعظیم و توقیر، پنسن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام، لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

اور ایک نقل سنو۔ وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے

ہوئے ہیں، اہلِ اسلام نہیں ہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ تو آفت دلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور سب شہروں میں عمل داری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے: ''ٹکٹ آبادی درون شہر دلی بہ شرطِ ادخال جرمانہ'' مقدار روپے کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبے سے دیکھیے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں۔

یہ تو کیفیت عموماً شہر کی ہے۔ خصوصاً میرا حال سنو۔ بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کو حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنسن وار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا اور آیندہ کو پنسن جاری ہو جائے گا۔ نہ صاحب، یہ تو ممکن ہی نہیں، بعد ثبوت افلاس مستحق ٹھہروں گا۔ چھے مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پائے گا۔

(بنام میر مهدی مجروحؔ)

فروری ۱۸۵۹ء

''...... پنسن کے باب میں الجھے ہو اور کیا بے جا الجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء عیسوی سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینا ہے۔ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بہ طریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آیندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا..........

علی بخش خاں پچاس روپے مہینا پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنسن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپے مہینا، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ملے۔ متاجماعہ دار دس روپے مہینے کا سک لمبر۔ سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو بھر مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بہ طریقِ مدد خرچ سو روپے مل جائیں، میں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنسن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپے

کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔
آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر، اجرٹن صاحب بہادر بہ طریق ڈاک کلکتے چلے گئے۔ دلی کے حمقا، جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہوگی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔"

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

فروری، مارچ ۱۸۵۹ء

"دہلی کی اجنٹی کا دفتر فرد فرد لٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطہ میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔"

(بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ)

۷/مارچ ۱۸۵۹ء

"دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے...... میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کماہو حقہٗ سمجھ لو۔ وللہ حسن الطاف خفیتہ۔ ایک طرز خاص پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکمِ پنجاب کو لکھا کہ حاکمِ دہلی سے فلاں شخص کے پنسن کے کل چڑھے ہوئے روپے یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر، ہمارے پاس بھیج دو تا کہ ہم حکم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو، اس کی تعمیل بہ طرزِ مناسب یہاں ہوگئی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا اور ہاں، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپے کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا: صاحب، یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا، اور مجھے سو روپے دلواتے ہو؟ فرمایا کہ "تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا، اوروں کو یہ بات شاید برسوں میں میسر آئیگی۔" میں چپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے، دو پہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپے منگا لوں۔ پر، یار، ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے، مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھئے، یہ دو حاکم یعنی حاکمِ دہلی اور حاکمِ پنجاب، اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟ چناں چہ حاکمِ دہلی نے کتاب یہی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دی۔ اب دیکھوں، حاکمِ پنجاب کیا لکھتا ہے۔..." (بنام میر مہدی مجروحؔ)

۲۷ / مارچ ۱۸۵۹ء

" بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہوجاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے، آج ۲۷ / مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔"

(بنام میر مھدی مجروح)

مارچ ۱۸۵۹ء

" سنو داستان: صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنج شنبہ ۲۴ / فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ / فروری کو گیا، ملاقات ہوئی، کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب، حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو، سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکۂ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوادیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ ۔ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا: " ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔" میں نے عرض کیا: " کل حاضر کروں گا۔" پھر پنسن کا حال پوچھا، وہ بھی گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔ دیکھو میر مہدی، حاکمِ پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع ؟ پنسن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بہ حکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے اور یہ صورت مقدمۂ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے دن یک شنبہ یومِ تعطیل تھا، میں اپنے گھر رہا۔ دو شنبہ ۲۸ / فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا: " اچھا توقف کرو۔" بعد تھوڑی دیر کے .... باہر نکلے میں نے کہا: " وہ کتابیں حاضر ہیں۔" کہا " منشی جیون لال کو دے جاؤ۔" ...... سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا۔ بہت التفات اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا، وہ دیکھ کر یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے: " بہت اچھا" کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمہاری پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب (مجسٹریٹ دہلی) کو کچھ لکھا ہے، تم ان سے ملو۔ عرض کیا: " بہتر" ۔ اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا گئے ہوئے تھے، کل وہ آئے۔ آج میں نے ان کو خط لکھا ہے۔ جیسا وہ حکم دیں گے، اس کے موافق عمل کروں گا۔ جب بلائیں گے، تب جاؤں گا۔

دیکھو سید، اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو، کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس محکمے سے کہ وہ آج سلطنت کا دہندہ ہے، میرے تفقد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے مجھ کو عزت دلوائی۔ میرے صبر وثبات کی داد ملی۔ صبر وثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا، میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟۔''

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۱۹/اپریل ۱۸۵۹ء

''ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور نہیں۔''

(بنام شیونرائن آرامؔ)

اپریل ۱۸۵۹ء

''دلی کا حال تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ وہ خبر محض غلط ہے۔ اگر کچھ ہے کہ تو بدیں نمط ہے کہ چند روز گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا، اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے بہ اتفاق رائے ہمد گر ایسا بندوست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن وامان ہے۔''

(بنام حاتم علی مہرؔ)

۱۲/جون ۱۸۵۹ء

''یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی: نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں۔ سو ان کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں، مع ہٰذا یہاں کی اقامت میں تذبذب، خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے (اخبار) ''آفتاب عالم تاب'' کی خریداری کر لی ہے۔ اب وہ مکرر'' حالاتِ دربار شاہی'' کیوں لیں گے؟ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اس طرف کیوں توجہ کریں گے؟ تم ادھر کا خیال، دل سے دھو ڈالو۔''

(بنام شیونرائن آرامؔ)

۱۸ر جون ۱۸۵۹ء

آبادی کا آوازہ پھر فرد ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوئے ہیں۔ کئی ہزار کی بستی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا..........

اب میرا دکھ سنو: بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بے وفائی و نمک حرامی کا دھبا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا، اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا :

بہ زر زد سکہ ٔ کشورستانی سراج الدین بہادر شاہِ ثانی

مجھ سے عندالملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ 'یہ' کیا لکھتا ہے،؟ میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا؟۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔ اس وقت تو چپ ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھوا گیا کہ یہ جو اسد اللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنسن کے پانے کا مستحق نہیں ہے..........

بھائی، یہاں منشی میر احمد حسین ولد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں، تو میں مرشد آباد میں تھا۔ وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا۔ ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اس سکے کا گزارنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع کر رکھتے ہیں۔ اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے اور وہ پرچہ اخبار اصل بجنسہ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ میں نے اکبر آباد و فرخ آباد و مارہرہ و میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا ہے۔ ایک کالپی کو لکھنا باقی ہے۔ وہ بھی کل پرسوں لکھوں گا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء تین مہینوں کے بارہ پرچہ اخبار دیکھے جائیں۔''

(بنام نواب حسین مرزا)

جون ۱۸۵۹ء

''جناب چودھری صاحب! آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے۔ یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔

تفصیل یہ ہے کہ مولوی محمد باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا، مسمّیٰ بہ "دہلی اردو اخبار" بعض اشخاص سنینِ ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یہاں یا کسی آپ کے دوست کے یہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے آگے کے اوراق دیکھے جائیں، جس میں بہادر شاہ (ظفر) کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں، آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوقؔ نے اسی مہینے میں یا دو ایک مہینے کے بعد سکے کہہ کر گزرانے ہیں۔ احتیاطاً پانچ چار مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام (اصرار) ہے کہ اگر بمثل کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس پر علم ہو تو وہاں سے منگوا کر بھیجیے۔"

(بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ)

جون، جولائی ۱۸۵۹ء

"مولانا (فضل حق خیرآبادی) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا، کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا، بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا، ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے، کیا ہوتا ہے! جو ہونا تھا، سو ہولیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔....... وہ "دہلی اردو اخبار" کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے، ورنہ خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکامِ صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں، اور اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے؟ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟ ہاں صاحب، گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے، اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔"

(بنام یوسف میرزا)

۱۵ر جولائی ۱۸۵۹ء

"اپنے چھوٹے ماموں صاحب کو میرا اسلام بہ اعتبار محبت کے اور بندگی بہ اعتبار سیادت کے اور دعا بہ اعتبار یگانگی اور استادی کے کہنا اور کہنا کہ بھائی اور کیا لکھوں؟ جس حکم کی نقل کے واسطے تم لکھتے ہو وہ اصل کہاں ہے کہ جس کی نقل لوں؟ ہاں زبان زدِ خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں، مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

اے لو، کئی دن ہوئے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہیں۔ دیکھیئے حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندرائے کی مختار کاری پر قناعت کی گئی۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنسن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپے مہینا پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چوں کہ تمہارے بھائی مجرم تھے، تمہارا پنسن ضبط۔ بہ طریق ترحم دس دس روپے مہینا تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا! میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس، پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ترپن برس کا پنسن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و منظوری گورمنٹ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملے گا۔ خیر، ایک احتمال ہے ملنے کا۔ جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اسکے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل، اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر، ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون''

(بنام نواب یوسف مرزا)

۲۸؍جولائی ۱۸۵۹ء

''آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے۔ ایک بنائے قدیم رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا؟ یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے، جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائیگا۔ محبوب کی دکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچہ سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائیگا۔ یوں سمجھو کہ امو جان کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثارِ عمارت باقی نہ رہیں گے۔ آج جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دلی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہل شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟

(بنام نواب یوسف مرزا)

جون، جولائی ۱۸۵۹ء

''ایک لطیفہ پرسوں کا سنو، حافظ مَمّو بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔

پرسوں وہ حاضر ہیں۔ مسل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ میں، اصلی نام میرا محمد بخش ہے۔ ممو ممو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم، سارا جہاں بھی تم، جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مسل داخلِ دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے۔

(بنام نواب یوسف مرزا)

اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۹ء

''سکے کا دار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوقؔ نے یہ دو سکے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے انہوں نے ''دلی اردو اخبار'' میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب تک وہ لوگ موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے ہر چند قلمروِ ہند میں ''دلی اردو اخبار'' کا پرچہ ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبا مجھ پر رہا۔ پنسن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان، خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا، چوں کہ موافق رضائے الٰہی کے ہے، اسکا گلہ کیا:

چوں جنبش سپہر بہ فرمان داور ست

بے داد نبود آنچہ بما آسماں دہد

(بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ)

۵ رنومبر ۱۸۵۹ء

خدا کے واسطے، میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟ بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے، وہ محض غلط۔ ہاں، مرزا الٰہی بخش جو شہزادوں میں ہیں، ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں، دیکھیے کیا ہو۔ حکیم جی کو ان کی حویلیاں مل گئی ہیں، اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں:

تو بے کسی، غریبی، ترا کہ می پرسد

نہ جزا نہ سزا، نہ نفریں نہ آفریں، نہ عدل نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر۔ پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی، اب صرف روٹی ملے جاتی ہے، شراب نہیں۔ کپڑا ایامِ تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے، اس کی کچھ فکر نہیں ہے، مگر تم کو میرے سر کی قسم، یہ لکھ بھیجو کہ میری خبر تم نے کیا سنی؟ مجھے اس کے

معلوم ہونے سے مزہ ملے گا۔

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۸ر نومبر ۱۸۵۹ء

''نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غم گین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے، آج کاغذ اور ٹکٹ کہیں سے منگالوں گا۔........

پون ٹوٹی کوئی چیز ہے، وہ جاری ہوگئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر محصول نہ لگا ہو۔

جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ (درس گاہ) دارالبقا فنا ہوجائیگی، رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا، دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔''

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۹ر نومبر ۱۸۵۹ء

''آج کل یہاں پنجاب احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی (ٹاؤن ڈیوٹی = محصول چونگی (چنگی)) کے باب میں کونسل ہوئی، پرسوں ۷ر نومبر سے جاری ہوگئی......غلے اور اپلے کے سوا، کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔

آبادی کا حکم عام ہے خلق کا ازدہام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں۔ کرایہ دار نہ رہیں، پرسوں سے حکم ہوگیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے وہ بھی آ رہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں!'' تم انصاف کرو!

ہمشیر کی درخواست کیوں کر گزرے؟ جب وہ خود آئیں اور درخواست دیں اور منظور ہو اور مکان ملے تو اس تمام شہرستانِ ویران میں سے ایک حویلی ملے گی اور ان کو یہاں رہنا ہوگا۔ کیوں کر اس ویرانہ میں تنہا رہیں گی؟ سہم کر دم نکل جائے گا۔ مانا کہ جبر اختیار کر کر رہیں، کھائیں گی کہاں سے؟ بہر حال......نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہوجائیں، حکام بے پرواہ، مختار کار عدیم الفرصت.........

حکیم احسن اللہ خاں کے مکاناتِ شہر ان کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔

نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض پر کرایے کے مکانات میں مع متوسلین کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں۔

مرزا الٰہی بخش کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زمین پکڑی ہے۔ سلطان جی میں رہتے ہیں۔ عذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جبر اٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔

(بنام نواب حسین مرزا)

۲۷ر نومبر ۱۸۵۹ء

''اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہ سمجھا کہ بے گناہ ہوں یا گنہ گار؟ مقبول ہوں یا مردود؟ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں۔ لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے''

(بنام نواب یوسف علی خاں ناظمؔ)

۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء

''عزت، غمِ مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں.... غمِ فراقِ حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے، گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا، اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں، ایک بی بی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز یہ باہر، مداری کے جورو بچے بہ دستور، گو یا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقامِ معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ بہ قدر سدِ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام

سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں۔ بھوت نہیں، ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعفِ قویٰ، اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں، نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بہ قدر طاقت بنائے رکھتا تھا، اب میسر نہیں۔"

(بنام نواب یوسف میرزا)

۲/ دسمبر ۱۸۵۹ء

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روزہ بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر پندرہ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھئے کہاں اترتے ہیں۔ اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو، چار معدوم محض تین جو باقی رہے، اس میں سے دو جانہ ولوہارو تحتِ حکومت ہانسی۔ حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر، ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس، بس۔ رہے دربارِ عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا　　آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ، بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔"

(بنام میر مهدی مجروح)

۱۶/ دسمبر ۱۸۵۹ء

"میرا دربار اور خلعت، دریا برد ہو گیا۔ نہ پنسن کی توقع، نہ دربار اور خلعت کی صورت، نہ سزا، نہ انعام، نہ رسم معمول قدیم...فیل خانہ، ملک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات، سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ اہلِ فوج ڈھانا چاہتے ہیں، اہلِ قلم (سول حکّام) بچاتے ہیں۔

پایانِ کار دیکھئے کیا ہو۔“

(بنام نواب حسین مرزا)

۳۱؍دسمبر ۱۸۵۹ء

”شنبہ اکتیس دسمبر ۱۸۵۹ء گیارہ بجے ہوں گے۔ میں خط لکھ رہا ہوں، تو پیں چل رہی ہیں۔ شاید راجا صاحب کی ملاقات اسی وقت ہوئی۔ کل یک شنبہ ہے۔ پرسوں دو شنبے کو یا سہ شنبہ کو لارڈ صاحب کا کوچ ہے۔ کہتے ہیں کہ پشاور تک جائیں گے۔.......

مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو؟ وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی تھی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرادی گئیں۔ سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخلِ خزانہ ہوا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا عملہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہِ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟ تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ کیسا نوندراے، کیسی نقلِ حکم، کیسا مرافعہ۔ جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکام قضا و قدر ہیں، ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک رکھتے تھے، نہ پنسن رکھتے تھے۔ رام پور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔ جب تم لکھتے ہو کہ للہ تم وہاں جاؤ تو مجھ کو ہنسی آتی ہے۔“

(بنام نواب حسین مرزا)

یکم جنوری ۱۸۶۰ء

دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ دلی کے علاقے کے جاگیر دار، بموجبِ حکم کمشنر دہلی، میرٹھ گئے۔ موافق دستورِ قدیم مل آئے۔ غرض کہ پنج شنبہ ۲۹؍دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازے کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا، میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں، یہ جواب سن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔........ مسلمان کی املاک کی واگزاشت کا حکم عام ہو گیا ہے۔ جن کو کرایے پر ملی ہے، ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔“

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۹ر جنوری ۱۸۶۰ء

''کشمیری کٹرا اُگڑ گیا ہے۔ ہائے! وہ کیا اونچے اونچے دراور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دورویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں؟۔''

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

اواخر مارچ ۱۸۶۰ء

''گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے (پاٹودی، دوجانہ اور لوہارو) ان کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی باقی نہ تھا، یا چند مہاجن۔ مجھ کو حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہوسکتا۔ جب یہ، سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی، میں اپنی عادتِ قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ (میر منشی) مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ 'فرصت نہیں'۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام کا لکھ کر، ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے، امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو، تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہِ گذشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار و خلعت موقوف، پنشن مسدود، وجہ نامعلوم۔ لاموجود الا اللہ ولا موثر فی الوجود الا اللہ

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال (۱۸۵۵ء) میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظمؔ ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنشن کھلا ہوا، ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔''

(بنام خواجہ غلام غوث خاں بے خبرؔ)

اپریل ۱۸۶۰ء

''راہ و رسمِ مراسلت حکام عالی مقام سے بہ دستور جاری ہوگئی ہے۔''

(بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ)

۱۹؍مئی ۱۸۶۰ء

مصطفیٰ خاں (شیفتہؔ) کی رہائی کا حکم ہوا، مگر پنسن ضبط......

تمہارے ماموں کے پاس بھیج دیا ان کی جائداد کی واگزاشت کا حکم تو ہو گیا ہے اگر ان کے بڑے بھائی کے یاران کو چھوڑیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے...ہو گا کیا؟ اگر جائدادیں مل بھی گئیں تو قرض دار دام دام لیں گے''

(بنام نواب یوسف میرزا)

اوائل مئی ۱۸۶۰ء

''تنخواہ کی سنو: تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئے۔ سو (روپے) مدد خرچ کے جو پائے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو عملۂ فعلہ کی نذر ہوئے، مختار کار دو ہزار لایا۔ چوں کہ میں اس کا قرض دار ہوں، روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجئے۔ حساب کیا، سود مول سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ میں نے کہا، میرے قرضِ متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے، نو سو بچے، آدھے تو لے، آدھے مجھے دے، وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو، پان سو سات تم لو، یہ جھگڑا مٹ جائے گا، تب کچھ ہاتھ آئے گا، خزانے سے روپیہ آ گیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دارو گیر سے بچنا معجزۂ اسد اللٰہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ ید اللٰہی ہے۔ حاکمِ شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنسن پانے کا مستحق نہیں، حاکمِ صدر مجھ کو پنسن دلوائے اور پورا دلوائے۔''

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۱۱؍جون ۱۸۶۰ء

''.... وہاں بعد اس فساد کے ایک کون ہو گا (بگاڑ کے بعد بناؤ کی صورت نکلے گی) یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے۔ جو دیکھے گا، وہ داد دے گا اور دلی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت، سوائے اس بازار کے جو قلعے کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے۔''

(بنام میاں داد خاں سیاحؔ)

۳۰؍جون ۱۸۶۰ء

''لکھنؤ کا کیا کہنا! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سرو پا وہاں

پہنچا، امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصلِ خزاں!''

(چودھری عبدالغفور سرور)

۸ ر جولائی ۱۸۶۰ء

''صاحب! میری داستان سنئے۔ پنسن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زرِ مجتمعۂ سہ سالہ یک مشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینہ بہ دستور ملا۔ آخر جون میں حکم ہو گیا کہ پنسن دار علی العموم شش ماہی پایا کریں۔ ماہ بہ ماہ پنسن تقسیم نہ ہوا کرے۔''

(بنام نواب علاء الدین احمد خاں علائی)

۲۰ ر جولائی ۱۸۶۰ء

''اب میری کہانی سنو: آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آ گیا کہ پنسن دارانِ قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار، بہ طریق شش ماہہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار، ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا۔ تارام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کٹوا دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی۔''

(بنام منشی ہر گوپال تفتہ)

۲۴ ر اگست ۱۸۶۰ء

حضرت، انہدامِ مساکن و مساجد کا حال کیا گزارش کروں؟ بانیٔ شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہوگا جو اب والیانِ ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ۔ قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں، بلکہ قلعے میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا۔ سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین اڑا دیے گئے۔

غلے کی گرانی، آفتِ آسمانی، امراضِ دموی بلائے جانی، انواع و اقسام کے اورام و بثور شائع۔ چارہ ناسودمند اور سعی ضائع۔ میں نہیں جانتا کہ گیارہ ماہ مئی ۱۸۵۷ء کو پہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا جنودِ قہرِ الٰہی کا پے در پے نزول ہوا تھا۔ بہ قدرِ خصوصیت سابق، دلی ممتاز ہے، ورنہ سرتاسر قلمروِ ہند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

(بنام نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق)

ستمبر ۱۸۶۰ء

''پنسن جاری ہو گیا، تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ستاسی روپے گیارہ

آنے بچے۔ اب ماہ بہ ماہ روپیہ ملتا ہے مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے، دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ شش ماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سینکڑا سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپے مہینا آیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے کے ساتھ رہیں گے۔ کچھ رام پور سے ماہ بہ ماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش و ناخوش گزارا ہوا جاتا ہے۔

یہاں شہر ڈھ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے؟ صاحبانِ امکنہ اور دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں تھی؟

برسات بھر مینہہ نہیں برسا۔ آبِ تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے، میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ بارہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ کوار کا مہینا جسے جاڑے کا دوار کہتے ہیں۔ پانی گرم، دھوپ تیز، روز لو چلتی ہے۔ جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔"

(بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ)

نومبر ۱۸۶۰ء

"میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپئے سال، اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپئے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر، ریزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر بہ مرگِ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے پادشاہِ دہلی نے پچاس روپے مہینا مقرر کیا، ان کے ولی عہد نے چار سو روپئے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس کے بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ پادشاہِ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پان سو روپئے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔

ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب میں جو والیٔ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو

کوشش اس کی ضائع جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے............

پایانِ عمر ہے، دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپے رام پور کے، ساٹھ روپے پنسن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امورِ عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔

(بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ)

۱۸؍دسمبر ۱۸۶۰ء

''میرن صاحب کو، جب تک تم نہ کہو، میں دلی نہ بلاؤں۔ گویا ان کے عاشق تمھیں ہو، میں نہیں۔ بھائی ہوش میں آؤ، غور کرو، یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپے مہینہ مقرر کروں کہ بھائی یہ لو اور روپیہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور لاہوری دروازے کا بازار ناپتے پھرو.... بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوراں خان کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔ اے میر مہدی! تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غم ہائے جاں گداز کی تاب لاؤں؟ مقدور رہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شد!

(میر مہدی مجروحؔ)

۱۸۶۰ء

''اللہ اللہ، دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسنِ اعتقاد! ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا اردو کہاں؟ دلی، واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔''

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۱۸۶۰ء

''..... پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا: پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی، مرے آدمی کم، لیکن جس کو

تپ آئی، اس نے پھر اعضاء میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں: ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

اہاہاہا، جناب حافظ محمد بخش صاحب! میری بندگی۔ مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہوکر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھو، حکیم رضی الدین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی بھی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب جا نہ سکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں، زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال، صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودے میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدرآباد میں رہے۔ سالِ گذشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہوگئی، لیکن صرف جان بخشی۔

روشن الدولہ کا مدرسہ، جو عقب ''کوتوالی چبوترہ'' ہے وہ، اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پاکر ضبط ہوئی اور نیلام ہوکر روپیہ سرکار میں داخل ہوگیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی، جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے ہیں۔ شاید بہاول پور بھی جائیں گے۔

(بنام نواب انور الدولہ سعدالدین خاں شفق)

ماقبل ۱۸۶۱ء

''اب اہل دہلی یا ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔''

(بنام میر مہدی مجروح)

۲۲/فروری ۱۸۶۱ء

''یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ اشخاص باقی، نہ امکنہ۔''

(بنام قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی)

۱۹/اپریل ۱۸۶۱ء

''(یہ حقیقت) جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔

صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیریر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں۔"

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۲۳رمئی ۱۸۶۱ء

"......ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالبؔ وہ بے خود و مدہوش، نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی۔"

(بنام مجروحؔ)

۲۲رستمبر ۱۸۶۱ء

"حامد علی خاں کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہوگئی۔"

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۴راکتوبر۱۸۶۱ء

"ہاں خاں صاحب! اب جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے (انڈمان) میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے۔؟"

(بنام میاں داد خاں سیاحؔ)

۱۸۶۱ء

"قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا، راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کوئی بانس نشیب تھا، وہ اب باغیچے کے صحن کے باربر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرا، دھوبی واڑا، رام جی گنج۔ سعادت خاں کا کٹرا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔"

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۱۹؍جنوری ۱۸۶۲ء

''مولوی صدرالدین صاحب (آزردہ) بہت دن حوالات میں رہے، کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی، اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔''

(بنام احمد حسن موزوںؔ)

۱۶؍فروری ۱۸۶۲ء

''اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کنپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینا پاتے ہیں۔ اناث میں جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنسن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر ناصرالدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا؟ بیمار پڑا، نہ دوا نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس ایک پیسا نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے، چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر، نوش جان کر کے، بہ یک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرایے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے، قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر، کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیانِ واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرفِ مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو بھی سچ جانو۔''

(بنام نواب علاؤالدین احمد خاں علائی)

۲۰رمئی ۱۸۶۲ء

''مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز یہ دستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔''

(بنام میاں داد خاں سیاح)

۱۹رجون ۱۸۶۲ء

''مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمینِ عرب میں چھوڑ دیا۔ اہاہا:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔''

(بنام علاء الدین احمد خاں علائی)

۱۱راگست ۱۸۶۲ء

''مکانات کے گرنے کا حال یہ ہے کہ چار پانچ برس ضبط رہے۔ یغمائی (لٹیرے) لوگ، کڑی، تختہ، کواڑ، چوکھٹ، بعض مکانات کی چھت کا مسالا، سب لے گئے۔ اب ان غربا کو وہ مکان ملے تو ان میں مرمّت کا مقدور کہاں: فرمایئے مکانات کیوں کر نہ گریں؟۔''

(بنام نواب انورالدولہ سعید الدین خاں بہادر شفق)

۶رنومبر ۱۸۶۲ء

''سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ (الور) کو اختیار ملے گا، مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔''

(بنام میر مهدی مجروحؔ)

۲۰رنومبر ۱۸۶۲ء

اودھ اخبار میں بادشاہ کے مرنے کی خبر لکھی دیکھی مگر پھر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی۔ نریندر سنگھ راجا پٹیالہ بے تکلف مر گیا۔ مسجد جامع کی واگذاشت کی خبر مشہور ہے۔ اگر سچ ہو جائے تو کیا دور ہے؟ شاہ اودھ کی املاک کی بھی واگذاشت کی خبر ہے۔

(بنام میر مهدی مجروحؔ)

۱۶ر دسمبر ۱۸۶۲ء

''مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ عشرہ مبشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے: مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضل حسین خاں ابن فضل اللہ خاں تین یہ، سات اور۔

۷ر نومبر، ۱۴ر جمادی الاوّل سال حال (۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ وقیدِ جسم سے رہا ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

(بنام میر مہدی مجروحؔ)

۴ر مارچ ۱۸۶۳ء

''اب میرا حال سنو:

در نومیدی بسے امید است
پایانِ شب سیہ سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر، خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ میں ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لیفٹننٹ گورنر پنجاب آئے ہیں، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلّی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مال گزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا، تم بھی انبالے جاؤ، شریک ہو کر خلعتِ معمولی لے آؤ۔ بھائی! کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری؟ گویا مردہ جی اٹھا۔''

(بنام منشی ہرگوپال تفتہؔ)

۱۶ر مارچ ۱۸۶۳ء

''منگل ۳ر مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ'' ہم تمہیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بہ دستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا۔'' میں نے عرض کیا کہ'' میں انبالے جاؤں؟'' فرمایا'' البتہ انبالے جانا ہوگا۔''

(بنام نواب یوسف علی خاں ناظمؔ)

۲۷ر مارچ ۱۸۶۳ء

''غدر سے پہلے ہر دربار میں خلعت پاتا تھا۔ بعد'' غدر'' دربار اور خلعت اور ملاقات

سکرتروں کی، یہ سب موقوف۔ اب جو لیفٹننٹ گورنر پنجاب آئے، تو انہوں نے خود مجھے بلا بھیجا اور خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم اپنی طرف سے از راہ محبت دیتے ہیں اور یہ نوید علاوہ کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں بھی دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو پاؤ گے۔ میں انبالے نہ جاسکا۔ بالفعل نواب گورنر کے خلعت پر قناعت کی۔ اس خلعت کو بہ شرطِ حیات اور وقت پر موقوف رکھا۔''

(بنام میر سرفراز حسین)

مارچ ۱۸۶۳ء

''ماجرا یہ ہے کہ میں نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنسن جاری ہوگیا، لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہل دفتر نے بموجب حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمہارا دربار اور خلعت واگزاشت ہوگیا، مگر دلی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لیفٹننٹ گورنر بہادر قلم رو پنجاب یہاں آئے۔ دربار کیا۔ میں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔''

(بنام سید غلام حسین قدر بلگرامیؔ)

اواخر مارچ ۱۸۶۳ء

''۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی اہالی دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا ''میں بھی چلوں؟'' فرمایا کہ ''نہیں'' جب لشکر میرٹھ سے دلی آیا، میں موافق اپنے دستور کے، روز ورودِ لشکر مخیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمے میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ 'تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔' میں گدائے مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے، میں نے قصیدہ حسبِ معمول قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس مطلق ہوکر بیٹھ رہا اور حکّامِ شہر سے ملنا ترک کیا۔

واقعہ اواخر ماہِ گذشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لیفٹننٹ گورنر پنجاب دلی آئے۔ اہالی شہر، صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانہ

محض اور مطرود حکام تھا، جگہ سے نہ ہلا۔ کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا، ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ ۸ رفروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا، بلالیا۔ مہربان پا کر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی، وہ بھی حاصل ہوئی۔ دو حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں، جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ جملہ معترضہ میر منشی لیفٹنٹ گورنر سے سابقہ تعارف نہ تھا، وہ بہ طریقِ حسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا۔ جب حکام بہ مجرد استدعا مجھ سے بے تکلف ملے، تو میں قیاس کرسکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف سے حسنِ طلب بہ ایمائے حکّام ہوگا، وللرحمٰن الطاف خفیۃ۔ بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بہ دستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر؟ حضرت نے کہا کہ "حاکمِ حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذ، انگریزی و فارسی دیکھے اور بہ اجلاسِ کونسل حکم لکھوایا کہ اسداللہ خاں کا دربار اور لمبر اور خلعت بہ دستور بحال و برقرار ہے۔" میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں، بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر چودہ دن یا پندرہ دن ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا، سبحان اللہ:

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

سہ شنبہ ۳ رمارچ کو بارہ بجے نواب لیفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا، خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ "لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔" عرض کیا گیا: حضور کے قدم دیکھے، خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا، میں نہال ہوگیا۔ اب انبالے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا:"

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہرچہ گیرید مختصر گیرید

(بنام خواجہ غلام غوث خاں بے خبرؔ)

اپریل ۱۸۶۳ء

"لو صاحب! ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت، اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں۔ ہاتھ پر ایک

زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔"

(بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

۳ر مئی ۱۸۶۳ء

"غدر کے رفع ہونے اور دلی کے فتح ہونے کے (تین برس) بعد میرا پنسن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہوا۔ مگر لارڈ صاحب کا دربار و خلعت جو معمولی و مقرری تھا مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبر مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے بھی ملنا میں نے موقوف کر دیا۔

بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لیفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی آئے۔ دربار کیا۔ خیر کرو، مجھ کو کیا؟ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا کہ نواب لیفٹننٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ (بیماری کی وجہ سے)....اٹھنا دشوار ہے، بہ ہر حال سوار ہوا، گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کیا، بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی، وہ حاصل ہوئی یعنی عنایت سی عنایت۔ اخلاق سے اخلاق۔ وقتِ رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ و اپنی طرف سے از راہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیر البہر اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جا۔ دربار میں شریک ہو، خلعت پہن۔ (بیماری کا) حال عرض کیا گیا۔ فرمایا خیر، اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا۔ اس پھوڑے کا برا ہو۔ انبالے نہ جا سکا۔"

(بنام شیو نرائن آرام)

۱۲ر مئی ۱۸۶۳ء

"نواب لیفٹننٹ گورنر جنرل منٹگمری بہادر اس شہر میں آئے تو مجھ کو یاد کیا۔ بہت عنایت فرمائی۔ ایک شالی رومال سوزن کار اور ایک گلوبند سوزن کار اور ایک الوان کی فرد چار گز لمبی، یہ تین کپڑے مجھ کو دیئے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے، مگر میری جان الجھی ہوئی ہے، لارڈ صاحب کے دربار و خلعت میں۔ فرمایا: "اچھا، اچھا۔" دوسرے دن لارڈ صاحب آئے ....تیسرے دن لیفٹننٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے گیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہرے اسا دری کے سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید تین رقم ہمیشہ پایا کیا ہوں اور اب یہ، اور دربار اور خلعت بند ہے۔ اس کا مجھ کو بڑا غم ہے، فرمایا کہ غم نہ کرو۔

تمہارا دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو دربار وخلعت پاؤ گے۔ میں نے اپنا ہاتھ دکھایا اور کہا کہ حضرت ! بوڑھا ہوں اور زخمی ہو گیا ہوں۔ انبالہ کس طرح جاؤں گا؟ خیر آئندہ دربار میں پاؤ گے......مولوی اظہار حسین خاں میر منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمہارے دربار وخلعت کے واگزاشت کا حکم دے کر کلکتہ سے ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔..........

واگزاشت کا حکم سنتا ہوں کہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس تحریر اس حکم کی بھی ابھی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہوئی، یعنی نہ میں دربار میں گیا، نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ملاقات اور ان کا خلعت اور امر ہے، یہ اور بات ہے۔ اس امر اور اس بات سے اس کو ہرگز علاقہ نہیں۔ اب میں نے جناب کرنیل ڈورینڈ ہے چیف سکرتر کو فارسی میں خط بھیجا ہے...جاننا چاہئے کہ گورنمنٹ سے میرے واسطے تین دستور مقرری جاری ہیں: دربار، خلعت، خط، بعد غدر کے تینوں دستور بند ہو گئے۔ اب دربار اور خلعت کی واگزاشت کی خبر سن کر سکرتر صاحب کو خط لکھا ہے جواب آنے پر دل جمعی کا مدار ہے۔''

(بنام میرزا عباس بیگ)

۱۳ر مئی ۱۸۶۳ء

''نہ وہ حکام ہیں جن کو میں جانتا تھا۔ نہ وہ عملہ ہے جن سے میری ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔'' یا حافظ'' ''یا حفیظ'' وردِ زبان ہے۔''

(بنام سید بدرالدین احمد کاشف المعروف بہ فقیر)

۴ر اگست ۱۸۶۳ء

''جب انبالے میرا جانا نہ ہوا تو میں نے قصیدۂ مدح جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بہ طریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مراد سے بھیجا، کہ آپ اس کو جناب نواب معلّٰی القاب کی نظر سے گزرانیں اور یہ دستور قدیم تھا کہ جب میں قصیدہ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرتر بہادر کا خط، بے واسطۂ حکامِ ماتحت مجھ کو آ جاتا۔ اب جو میں نے موافقِ معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا صدائے برنخاست، ناامید ہو کر بیٹھ رہا، بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسمِ تحریر خطوط نہ رہی تو دربار اور خلعت کہاں؟ ناگاہ کل شام کو جب صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں آیا، وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔''

(بنام محمد یوسف علی خاں ناظمؔ)

۱۸/جنوری ۱۸۶۴ء

آپ کا پیامِ روح افزا پہنچا بلکہ وہ عبارت سراسر بشارت میں نے خود پڑھ لی۔ جناب سری مہاراؤ راجا بہادر نے، جو میرے حق میں فرمایا، سو بجا ہے۔

پانچ برس کی میری عمر تھی کہ میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہ مہاراؤ راجا بختاور سنگھ بہادر کی رفاقت میں مارا گیا۔ سرکار نے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گاؤں جس کا تالڑا نام ہے مجھ کو برائے دوام ملا۔ آپ یوں سمجھئے کہ ادھر دودھ پینا چھوڑا اور اُدھر راج کی روٹی کھائی۔ چار برس کے بعد نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا مر گیا۔ نو برس کی عمر میں سرکار انگریزی سے، بہ عوض چچا کی جاگیر کے، نقدی مقرر ہوئی۔ ابتک اسی پر معاش کا مدار ہے۔ عمر بھر میں نوکری کی تو بہادر شاہ سے ''نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ'' خطاب پایا۔ کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا، پھر استاد کہلایا۔ اب ایک کم ستر برس کی عمر ہے۔ کانوں سے بہرا ہو گیا ہوں، بغیر لاٹھی کے چل نہیں سکتا۔ تکیہ یا دیوار کے آسرے بغیر بیٹھ نہیں سکتا۔ دنیا دار نہیں، فقیر ہوں، بہت سی عزت اور تھوڑی سی دولت چاہتا ہوں۔ حضور کو خدا سلامت رکھے۔ وہ مجھے عزت بھی دیں گے اور دولت بھی بخشیں گے۔ قطع نظر اس سے حضور کا جمال دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ میں نے تو مسند نشینی کی تہنیت اور تاریخ کا قطعہ مع عرضداشت کے بھیجا۔ حضور نے کیوں میری عرضی کا جواب نہ لکھا اور کیوں مجھ کو نہ بلا بھیجا؟ راج کا قدیم متوسل، انگریز کا پنسن دار اور خیر خواہ بعد غدر کے پنسن جاری۔ گورنمنٹ سے اور حکام دہلی سے ملاقاتیں بہ دستور۔ خطوط کی آمد و رفت طرفین سے بہ دستور۔ اب حضور بہ فتح و نصرت سفر سے معاودت فرمائیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ حاضر ہوں گا اور وہ سب کاغذ نظر سے گزرانوں گا۔

آپ سے خاص اس مہربانی کا امیدوار ہوں کہ یہ خط اپنے نام کا بہ احتیاط اپنے پاس رہنے دیجئے، جب حضور تشریف لائیں تو یہ خط حضور کی نظر سے گزاریے۔ میں تو حضور کے تشریف لانے کی خبر سن کر فوراً الور روانہ ہوں گا، انشاء اللہ العلی العظیم''

(بنام میر بندہ علی خاں عرف مرزا دبیر)

۸/مئی ۱۸۶۴ء

''میں کروں کیا؟ فی الحال دودمانِ معنی کا وہ حال ہے جو ہندوستان کا غدر کے بعد ہو گیا۔ جہلا جانتے نہیں، علماء اعتنا نہیں کرتے۔''

(بنام قاضی عبدالجمیل جنونؔ بریلوی)

۲۳ر جون ۱۸۶۴ء

"تمہارا شہر میں ہونا موجبِ تقویتِ دل تھا۔
گو، نہ ملتے تھے، پر ایک شہر میں تو رہتے تھے......
بھائی! ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیورِ آشیاں گم کردہ کی طرح، ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آ جاتے ہیں۔"

(بنام نواب امین الدین احمد خاں)

۲۶ر دسمبر ۱۸۶۴ء

"دلی، اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا، نہ اطرافِ شہر کے روسا۔"

(بنام نواب یوسف علی خاں ناظمؔ)

۳۰ر جولائی ۱۸۶۵ء

"فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود۔ انگریزی پنسن مسدود۔ یہ بزرگوار (والی رام پور)) وجہ مقرری ماہ بہ ماہ اور فتوح گاہ بہ گاہ بھیجتا رہا، تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔"

(بنام میاں داد خاں سیاحؔ)

۱۸ر دسمبر ۱۸۶۶ء

"پیش از غدر گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں۔ بعدِ غدر اگرچہ پنسن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل بارہ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباروں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہو گی، ایک رباعی کاغذِ مذہب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ عنایت سن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم۔ بارے بروقتِ ملاقات، تعظیم معمولی اور مصافحہ کر کے لارڈ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا اور فرمایا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ مالائے مروارید میر منشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے دوشالہ ایک۔ کمخواب کا تھان ایک۔ بنارسی تھان سنہری بوٹے ایک۔ بنارسی سیلا ایک۔ الوان کی چادر کلابتون ایک۔ کتاویز کا تھان ایک۔ الوان کی چادر بے کنارہ ایک۔"

(بنام نواب کلب علی خاں)

۱۵؍فروری ۱۸۶۷ء

''بعد غدر، بجرمِ مصاحبت بہادر شاہ، دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری برأت کی درخواست گزری، تحقیقات ہوتی رہی، تین برس کے بعد پنسن چھٹا۔''

(بنام حبیب اللہ ذکا)

☆☆☆

مـــاخـــذ

چند اہم کتابیں جن سے اس تصنیف میں مدد لی گئی۔

نمبر	کتاب	مرتب / تفصیل	مقام و سال
۱.	بیاضِ غالب	سالِ تالیف ۱۸۱۶ء	غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس بیاض کو 'نقوش' لاہور (جون ۱۹۶۰ء) شائع کرچکا ہے۔
۲.	دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ	سالِ تالیف ۱۸۲۱ء	لاہور ۱۹۶۹ء
۳.	دیوانِ غالب، نسخۂ شیرانی	سالِ تالیف ۱۸۲۶ء	لاہور ۱۹۶۹ء
۴.	دیوانِ غالب مع شرح نظامی	۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء	بدایوں
۵.	دیوانِ غالب نسخۂ عرشی		علی گڑھ ۱۹۵۸ء
۶.	دیوانِ غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) نسخۂ رضا، تیسرا ایڈیشن	مرتبہ کالی داس گپتا رضاؔ	ممبئی ۱۹۹۵ء
۷.	دستنبو، مترجمہ، رشید حسن خاں	اردوئے معلّٰے	دہلی ۱۹۶۱ء
۸.	کلیاتِ نثر غالب		لکھنؤ ۱۸۷۱ء
۹.	اردوئے معلّٰے		لاہور ۱۹۲۲ء
۱۰.	عودِ ہندی		علی گڑھ ۱۹۲۷ء
۱۱.	یادگارِ غالب، خواجہ الطاف حسین حالیؔ	بہ تصحیح و ترتیب مالک رام	نئی دہلی ۱۹۷۱ء
۱۲.	مکاتیبِ غالب (ششم)	امتیاز علی عرشی	رام پور ۱۹۴۹ء
۱۳.	اسبابِ بغاوتِ ہند	سرسید احمد خان	دہلی، ۱۹۷۱ء
۱۴.	غالب کے خطوط	ڈاکٹر خلیق انجم	
۱۵.	جلد اوّل (دوسرا ایڈیشن)	// //	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۹۳ء
۱۶.	جلد دوم	// //	// // // // ۱۹۸۵ء
۱۷.	جلد سوم	// //	// // // // ۱۹۸۷ء

۱۸. جلد چہارم	ڈاکٹر خلیق انجم	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۱۹۹۳ء
۱۹. جلد پنجم	//	// // // // //	۲۰۰۰ء
۲۰. بین الاقوامی غالب سیمینار	ڈاکٹر یوسف حسن خان	نئی دہلی	۱۹۶۹ء
۲۱. ذکر غالب (چہارم)	مالک رام	دہلی	۱۹۶۴ء
۲۲. ذکرِ غالب (پنجم)	مالک رام		۱۹۷۶ء
۲۳. فسانۂ غالب	مالک رام	نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۲۴. ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	خلیق احمد نظامی	دہلی	۱۹۵۸ء
۲۵. الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) ترجمہ: محمد عبدالشاہد خاں شروانی	علامہ فضل حق خیرآبادی	بجنور	۱۹۴۷ء
۲۶. انقلاب ستاون	پی.سی. جوشی	دہلی	۱۹۷۲ء
۲۷. غالب اور انقلاب ستاون	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	نئی دہلی	۱۹۸۸ء
۲۸. آثارالصنادید	سرسید احمد خاں	دہلی	۱۸۴۷ء
۲۹. مقالات سرسید	محمد اسمٰعیل پانی پتی	لاہور	۱۹۶۲ء
۳۰. سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نورالحسن نقوی	علی گڑھ،	۱۹۷۹ء
۳۱. شاہ ولی اللہ کے سیاسی خطوط	خلیق احمد نظامی	دہلی	۱۹۵۰ء
۳۲. شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	عبیداللہ سندھی	لاہور	۱۹۴۲ء
۳۳. ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، از عبداللطیف	مرتبہ: خلیق احمد نظامی	الجمعیۃ پریس،	۱۹۵۸ء
۳۴. سرسید اپنے اقوال وافکار کے آئینے میں	عشرت علی قریشی	علی گڑھ،	۱۹۸۴ء
۳۵. احوالِ غالب	مرتبہ: مختارالدین احمد	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی،	۱۹۵۳ء
۳۶. تاریخِ اودھ	محمد نجم الغنی	نول کشور، لکھنؤ،	۱۹۱۹ء
۳۷. تاریخِ صحافتِ اردو	امداد صابری	فاروقی پریس دہلی،	۱۹۵۳ء
۳۸. تذکرۂ کاملانِ رامپور	احمد علی خاں شوق	ہمدرد پریس، دہلی،	۱۹۲۹ء

۳۹. حیاتِ جاوید — حالی — لطیفی پریس، دہلی، ۱۹۳۹ء

۴۰. حیاتِ غالب — محمد اکرام — فیروز سنز، لاہور

۴۱. خدنگِ غدر — معین الدین حسن — جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۷۲ء

۴۲. دہلی کا آخری سانس — مرتبہ: حسن نظامی — دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۲۵ء

۴۳. غالب — غلام رسول مہر — عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور، ۱۹۴۶ء

۴۴. فسانۂ غالب — مالک رام — لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، ۱۹۷۵ء

۴۵. مرحوم دہلی کالج — عبدالحق — مفیدِ عام پریس، لاہور، ۱۹۴۵ء

۴۶. یادگارِ غالب — حالی، مرتبہ: مالک رام — لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، ۱۹۷۱ء

۴۷. غالبیات: چند عنوانات — کالی داس گپتا رضا، — ممبئی، ۱۹۸۲ء

۴۸. سیرت سید احمد شہید — مولانا سید ابوالحسن علی ندوی — لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

۴۹. جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) — محمد ایوب قادری — کراچی، جون، ۱۹۷۶ء

۵۰. فضل حق اور سن ستاون — حکیم محمود احمد برکاتی — کراچی، ۱۹۷۵ء

۵۱. امتیاز حق — راجا غلام محمد — مبارکپور، ۱۹۸۰ء

۵۲. تاریخ اودھ، جلد ۵ — محمد نجم الغنی خاں — لکھنؤ، ۱۹۱۹ء

۵۳. غالب درونِ خانہ — کالی داس گپتا رضا — ممبئی، ۱۹۸۹ء

۵۴. غالب اور شاہانِ تیموریہ — ڈاکٹر خلیق انجم — نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

۵۵. گل رعنا از اسد اللہ خاں غالب — مرتبہ: مالک رام — دلی، ۱۹۷۰ء

۵۶. غالب شناسی — ظ-انصاری — ممبئی، ۱۹۶۵ء

۵۷. اسد اللہ خاں غالب مرد — کالی داس گپتا رضا — ممبئی، ۱۹۹۱ء

۵۸. سہو و سراغ — کالی داس گپتا رضا — ممبئی، ۱۹۸۰ء

۵۹. غالب کی بعض تصانیف — کالی داس گپتا رضا — ممبئی، ۱۹۹۰ء

۶۰. جنگ آزادی ۱۸۵۷ء — خورشید مصطفٰے رضوی — دہلی، ۱۹۵۹ء

61. Memoires of General Briggs London, 1885
62. W. W. Hunter, The Indian Musalmans Calcutta, 1945
63. Savarkar V.D., India's War of Independence Calcutta, 1930
64. Sir W. H. Russel, My Diary in India in the Year 1858-59 London, 1860
65. Marks Engels, The First Indian War of Independence-1857-1859 Moscow, 1978
66. Santimay Ray, Freedom Movement and Indian Muslims Delhi, 1979
67. Who's Who of Indian Martyrs, (I, II, III & IV) Edited by : P. U. Chopra, Ministry of Education, Govt. of India

اس کے علاوہ کئی رسائل کے خاص نمبر، عام شمارے اور انگریزی کتابیں۔

☆☆☆

Ghalib Aur Hamari Tehreek-e-Azadi
by : Shamim Tariq

شمیم طارق کی تصانیف - ایک نظر میں

''غالب اور ہماری تحریکِ آزادی'' کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ۲۰۰۷ء کا یہ ایڈیشن ۳۰ صفحات کے اضافے کے ساتھ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس سے پہلے شائع ہونے والے تحقیقی، تنقیدی، صحافتی اور تخلیقی فن پاروں کی تفصیل یہ ہے :

۲ - شہ رگ [شعری مجموعہ] ۱۹۸۲ء

۳ - سلطان جمہور ٹیپو شہیدؒ کی آخری آرام گاہ پر [تاریخ و تذکرہ] پہلا ایڈیشن: اگست ۱۹۹۸ء
دوسرا ایڈیشن: اکتوبر ۱۹۹۸ء

۴ - روشن لکیریں [اداریوں کا مجموعہ اور
بیسویں صدی کے آخری پچاس سال کی اردو صحافت کا تجزیہ] ۱۹۹۸ء

۵ - شرفِ محنت و کفالت [اسلام کے معاشی تصورات پر تحقیقی کتاب] پہلا ایڈیشن ۱۹۹۶ء
دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء
تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۰ء
چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۴ء

۶ - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور تصوف [تصوف] ۲۰۰۰ء

۷ - صوفیاء کا بھکتی راگ [کتاب نما، نئی دہلی کا خصوصی شمارہ] ۲۰۰۴ء

۸ - کالی داس گپتا رضا
[ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے ہندستانی ادب کے معمار سیریز میں شائع ہوئی) ۲۰۰۴ء

۹ - سید نجیب اشرف ندوی
[ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے ہندستانی ادب کے معمار سیریز میں شائع ہوئی) ۲۰۰۶ء

۱۰ - تصوف اور بھکتی [غیر مطبوعہ]